باب اوّل

سہو اً کسی سے اپنی کہانی اگر کہوں۔
طاقت کہاں ہے کہ نہ بارِ دگر کہوں۔

میری سوانح عمری۔ میری سرگذشت۔ میرا قصّہ۔ میرا افسانہ۔ میری کہانی آپ سے نہیں سُنی جاوے گی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ نہیں سُنی جاوے گی۔ میں جانتا ہوں۔ کہ نہیں سُنی جاوے گی۔ مجھے یقین ہے۔ کہ نہیں سُنی جاوے گی۔

سُنتے ہیں آپ سارے زمانے کا دردِ دل
کہئے تو میں بھی قصّۂ سوزِ جگر کہوں۔

میں وہ ہوں۔ کہ جس کے گھر میں چراغ مسرت کبھی روشن نہیں

ہوا۔ میں وہ ہوں۔ کہ تمام عمر تنکے چُنتا رہا ہوں۔ میں وہ ہوں۔ کہ ہمیشہ انگاروں پر لوٹتا رہا ہوں۔ میں وہ ہوں۔ کہ انگلستان کے مشہور مُصنّف سُوِیفٹ کی طرح ہمیشہ انجیل کی وہ آیت پڑھتا رہا ہوں جس کا مضمون یہ ہے "کہ اُس دن پر خدا کی مار ہو۔ جس دن میں پیدا ہوا تھا" ہاں ناظرین میں اُس تاڑ کے درخت کی مانند ہوں۔ جو بجلی سے جل جاتا ہے۔ جس کے تمام پتّے اور شاخیں جھڑ اور گر جاتی ہیں۔ مگر ٹھنڈ آندھیوں اور بارشوں کے صدمات سہنے کے لئے کھڑا رہ جاتا ہے ؎

اے پھولوں کی سیجوں پر سونے والو۔ اے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھانے والو۔ اے سوا لاکھ روپے کے چبوترے پر بیٹھنے والو۔ اے مقبلو جو ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ہو۔ تم کو میری مصیبتوں اور تکلیفوں کا حال معلوم ہونا دشوار ہے ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی
طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپارا

شاید لسان الغیب خواجہ حافظ یہ شعر میرے ہی لئے کہہ گئے ہیں ؎

شبِ تاریک وبیمِ موج وگردابے چنیں حائل
کُجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل ہا

میں نے ہر چند کوشش کی کہ میری کشتِ تمنّا سرسبز ہو۔ میرا بھی نخلِ مراد ہرا ہو۔ مگر بدبختی کی گھٹا اور ناکامی کے طوفان نے ہمیشہ اُس پر بجلی گرائی۔ اور میں سیاہ بخت ہمیشہ ذلت۔ رسوائی اور بے کلی کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ سچ ہے ؎

گلیمِ بختِ کسے را کہ بافتند سیاہ
بہ آبِ زمزم و کوثر سپید نتواں کرد

میں حیران ہوں۔ ان پر اَور ان کی عقل پر۔ جو قسمت کے قائل نہیں۔ قسمت ہے۔ اور قسمت ضرور ہے۔ کیا وجہ ہے۔ کہ میری لیاقت۔ میری قابلیت اور میری ہمت کے انسان جاہ و جلال کے تخت پر جلوس فرمائیں۔ اور میں بدقسمتی کی اٹھوائی کھٹوائی لئے پڑا ہوں۔ اور چراغ سحری کی طرح ہچکیاں لے رہا ہوں؟ کیا سبب ہے۔ کہ بعض کاٹھ کے اُلّو شہرت کے دربار میں کرسی نشین ہیں اور میں ایک طرف کونے میں دبکا پڑا ہوں؟ میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیوں اغیار بلا دردسر اس چیز کو حاصل کر لیتے ہیں جس کے لئے میں مہینوں اور برسوں ایڑیاں رگڑتا ہوں۔ اور پھر بھی مجھے نہیں ملتی؟ کیوں آپ میٹھی نیند سوتے ہیں۔ اور میری کروٹیں بدلتے میں رات بسر ہو جاتی ہے؟ کیوں آپ کے لئے اتفاق ہو جاتا ہے اور میرے لئے نہیں ہوتا؟

میرا باپ ایک آسودہ حال سوداگر تھا۔ وہ میری والدہ سے جو خدا بخشے۔ ایک نہایت شریف اور صاحب عصمت بی بی تھی۔ قریباً پچیس سال بڑا تھا۔ یعنی جس وقت میں پیدا ہوا۔ تو میری والدہ سولہ سال۔ اور میرا والد اکتالیس کا تھا۔ میرا والد نہایت زود رنج تیز مزاج غصیلا اور سنگدل تھا۔ ذرا سی بات پر آگ بھبوکا ہو جاتا تھا۔ ادنےٰ سے ادنےٰ معاملے پر غصے کی آگ اُس کے بدن میں بھڑک اُٹھتی تھی۔ معاذ اللہ اُس کا چہرہ طیش میں کبوتر کے خون یا آگ کے انگار کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھیں بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتی تھیں۔ اور پھر اُس کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا تھا۔ اُس مغفور کی ضد کا یہ عالم تھا۔ کہ جس بات پر قائم ہو جائے۔ پھر چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ مجال۔ اس سے نہ ٹلتا تھا۔ جب کسی پر مہربان ہو جائے۔ تو گھر کی کنجیاں تک اُس کے حوالہ کر دیتا تھا۔ کسی پر ناراض ہو۔ تو اُس کا دل یہ ہی چاہتا تھا۔ کہ اُسے کھڑا کھڑا چنوا دے ؎

میری والدہ برخلاف اس کے نہایت غریب مزاج اور سلیم طبع تھی۔ وہ نیک بی بی عصمت کا اوتار اور پاک دامنی کا زیور تھی۔ کبھی میں نے اُس کو بلند آواز سے بولتے یا کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ دن رات گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ اور گھر کے دھندے

سے فارغ ہو کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتی تھی۔ ناظرین میں نے کوئی ایسی شریف اور ایسی نیک عورت نہیں دیکھی۔ میرا آتش مزاج باپ اکثر اُسے ستاتا۔ اور دق کیا کرتا تھا۔ مگر اُس کے پاک ہونٹ کبھی شکایت سے آشنا نہیں ہوئے۔

اے کتاب کے پڑھنے والو۔ شاید آپ اس کو مبالغہ سمجھو۔ مگر وہ میری والدہ تھی اُس نے مجھے نو مہینے پیٹ میں رکھا تھا۔ اس نے مجھے ڈیڑھ سال تک دودھ پلایا تھا اُس نے میری خاطر اپنا آرام مدت تک تلخ کر دیا تھا۔ وہ مجھے ایسی حالت میں جب میں بیچارہ تھا۔ گودی میں لئے پھرتی تھی۔ میں جس قدر تعریف اس نیک بخت عورت کی کروں کم ہے۔ ہاں کم ہے۔ بے شک کم ہے۔

میں نو سال کا اور میری والدہ چھبیس سال کی تھی۔ کہ یکایک اُس نیک بندی کو پیغام موت کا آگیا۔ ایک دن اُس نے گرم گرم اٹھکر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ جس سے اُس کو اس شدت کا بخار چڑھا۔ کہ قبر میں اُتار کر اُترا۔ جس وقت زندگی کی امید منقطع ہو گئی۔ اور ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ تو اُس نے مجھے اور میرے باپ کو اپنے پاس بلوایا۔ اور ایک حسرت بھری نگاہ سے میری طرف پانچ منٹ تک دیکھتی رہی۔ اور ٹھنڈے سانس لے کر مجھے اپنے قریب بلایا گلے سے لگایا۔ منہ چوما۔

نے میرے آبا کی طرف نگاہ کی۔ اور کہا:۔
سردار حسین کے آبا میں آپ سے رخصت ہوتی ہوں مجھے اپنے مرنے کا کچھ غم نہیں ہے۔ جب ایک دن مرنا ہے۔ تو پھر مرنے سے کیا ڈرنا؟ چاہے انسان لاکھ برس جئے۔ آخر ایک دن مرنا ہے لیکن مجھے اس بات کا قلق ہے۔ کہ میں نے سردار حسین کی کوئی مراد نہ دیکھی۔ میں دنیا سے نامراد جاتی ہوں۔ افسوس دل کی حسرتیں دل ہی میں رہیں۔ میں اپنے دل میں خیالی پلاؤ پکاتی تھی۔ کہ سردار کے لئے خوب صورت دلھن لاؤں گی۔ اُس کے بال بچوں کو گودی میں اُٹھائے پھروں گی مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ میرے پیارے شوہر مجھے تمہاری طبیعت سے ڈر لگتا ہے۔ تم بلا کے تیز مزاج اور ایک رُخے ہو۔ میں نے نو سال لونڈیوں کی طرح تمہاری خدمت کی ہے۔ اور اس نو سال کی خدمت کے عوض میں آپ سے ایک التجا رکھتی ہوں۔ اور امید کرتی ہوں کہ تم اُس کو قبول کرو گے۔ دیکھو تمہاری عمر اس وقت پچاس سال کی ہے۔ اور اگرچہ خدا کے فضل سے ہر طرح تندرست ہو۔ مگر پھر بوڑھے ہو۔ میرے بعد اپنی شادی نہ کرنا اور سردار حسین کو کبھی میرے پیچھے نہ مارنا۔ دیکھو میں دیکھنے نہیں آؤں گی۔ مگر اس بن ماں کے بچے کو جو دق کرے گا۔ وہ میری

روح کو سخت صدمہ پہنچائے گا۔ اور حشر کو میں اُس کی گریبان گیر ہوں گی۔

یہ جگر شق کرنے والی گفتگو سن کر میرا والد آب دیدہ ہوا۔ اور بڑی دیر تک میری والدہ سے تشفی آمیز گفتگو کرتا رہا۔ اور مجھے اشارہ سے کہا۔ تو یہاں سے نکل جا۔ اس وقت تیری والدہ نازک حالت میں ہے۔ اور تیرے یہاں رہنے سے اُس کے آنسو نہیں تھمتے۔

حضرات ناظرین! اُس وقت میری عمر نو سال کی تھی۔ مگر میں معمول سے بڑھ کر ہشیار اور سمجھدار لڑکا تھا۔ میں جانتا تھا۔ کہ میری اماں۔ میری پیاری اماں۔ اب چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں مَیں یتیم ہونے والا ہوں۔ اور اب میں اُس سے جُدا ہونے والا ہوں۔ جس کے برابر دنیا میں کوئی شے نہیں ہے۔ اس لئے میرا دل نہ چاہتا تھا۔ کہ میں وہاں سے سرکوں اور جان بوجھ کر وہاں کچھ عرصہ ٹھیرا رہا۔ مگر میرے والد نے ایسی نگاہ سے میری طرف گھورا۔ کہ میں بید مجنوں کی طرح کانپ گیا۔ اور کان دبا کر دوسرے کمرے میں ایک چارپائی پر جا لیٹا۔ اور زار زار رونے لگا۔ صاحبو میں بہت دیر تک روتا رہا۔ آخر جب روتے روتے تھک گیا۔ تو مجھ پر غنودگی طاری ہوئی۔ اور میں سو گیا۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ انسان جس خیال میں سوتا ہے۔

وہی بات اُس کو خواب میں نظر آتی ہے۔ اُس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں تنہا ایک قبرستان میں کھڑا ہوں۔ رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف سناٹا ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ اُلو کی ہوک سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ گیدڑ کی آواز سے کلیجہ دہل رہا ہے۔ اور ایک تازہ قبر میں میری والدہ کفن پہنے کھڑی ہے۔ اور میری طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔ اُس وقت میں نے دیکھا۔ کہ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد ہے۔ اور چہرہ عجیب بھیانک اور ڈراؤنا ہو رہا ہے۔ چوں کہ میں اُس وقت تنہا اس قبرستان میں کھڑا ڈر سے کانپ رہا تھا۔ والدہ کو دیکھ کر میں نے ایک چیخ ماری۔ اور چاہا۔ کہ دوڑ کر اُس کے پاس جاؤں۔ کہ میری آنکھ کھل گئی۔ اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ دیکھا۔ کہ گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ عورتیں بین کر رہی ہیں۔ ابا جان آنکھوں پر رومال لئے بیٹھے ہیں۔ میری اماں ایک چارپائی پر پڑی ہیں۔ اُن کے پاؤں کے انگوٹھے دھجی سے بندھے ہوئے ہیں۔ رنگ زرد ہو رہا ہے۔ چہرے پر مُردنی چھائی ہے۔ ہونٹ سفید ہو رہے ہیں۔ ناک کا بانسا مُڑا ہوا ہے۔ آنکھیں کچھ کھُلی کچھ بند ہیں۔ مگر پتلیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور وہ اُس نیند سو رہی ہیں جس نیند سے آج تک کوئی نہیں جاگا ؞

باب دوم

حال دل جس سے کہا اُس نے کہا بس خاموش
داغ اِس درد کے سُننے کی ہمیں تاب نہیں

جب تک انسان زندہ ہے۔ تب تک ہر ایک اُس کا چاہنے والا ہے۔ جب مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتا ہے۔ تو پھر ہر ایک اُس سے بیزار ہو جاتا ہے۔ ہر ایک یہی چاہتا ہے۔ کہ جلدی غسل کراؤ۔ جلدی کفن پہناؤ۔ جلدی جنازہ اُٹھاؤ۔ وہ شخص جس کی جدائی ایک پل گوارا نہیں ہوتی۔ اُس کی لاش گھر سے اس طرح نکالی جاتی ہے۔ جیسے وہ کوئی آسیب ہے۔ یا سایہ ہے۔

جس وقت میری والدہ راہئی ملک عدم ہوئی۔ تو میں نو برس کا تھا۔ مگر مجھے وہ اس طرح یاد ہے۔ جیسے ابھی کل کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے۔ کہ جب میری والدہ کا جنازہ اُٹھایا گیا۔ اور لوگ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے گھر سے نکلے۔ تو میرے دل اور جگر میں درد ہونے لگا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی میرا کلیجہ ایک کُند چھری سے کاٹ رہا ہے + مجھے یاد ہے۔ کہ اُس وقت میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ اور مجھے یاد ہے۔ کہ میں روتا ہوا۔ اماں کے جنازے کے پیچھے دَوڑا۔ اور میرا پاؤں سیڑھیوں میں پھسلا۔ اور میں مُنہ کے بل گرا۔ اور میری نکسیر جاری ہوگئی + مجھے یاد ہے۔ کہ میرے مُنہ سے اُس وقت بے اختیار ہائے اماں کا لفظ نکلا + مجھے یاد ہے۔ کہ میری اماں جو میرے رونے کی آواز سُن کر فوراً دوڑی آئی تھی۔ اور مجھے فوراً اُٹھا کر پیار کرتی تھی۔ اُس وقت نہ آئی +

اے میرے خدا وہ کس طرح آتی۔ اُس کا جنازہ تو اُس وقت آہستہ آہستہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا + میں نے اُس وقت اپنے گرنے کی کچھ پرواہ نہ کی میرے گھٹنے چھل گئے تھے۔ پاجامہ گھٹنوں پر سے پھٹ گیا تھا۔ ناک سے خون جاری تھا۔ منہ پر خاک ملی ہوئی تھی۔ اور ہائے اماں ہائے اماں کرتا ہوا جنازہ کے پیچھے بھاگا جاتا تھا + میرے والد نے مجھے اُس حالت میں دیکھا۔ تو بجائے اس کے کہ اُن کو رحم آتا۔ اُنہیں الٹا غصہ آگیا + نہایت سخت خفا ہوئے۔ اور آنکھیں نکال کر میری طرف گھورا۔ اور کہا۔ کہ او ناشدنی تو ساتھ جا کر کیا کرے گا؟ جا گھر جا کر بیٹھ۔ اور مُنہ ہاتھ دھو۔ قبرستان بہت دور ہے۔ تو پیادہ وہاں تک نہیں جا سکے گا۔ ناحق تھک

جائے گا۔ اور بیمار ہو جائے گا۔

اگرچہ دل یہی چاہتا تھا۔ کہ ساتھ ساتھ جاؤں۔ مگر حکم عدولی کی مجال نہ تھی۔ ناچار روتا ہوا واپس آیا۔ اور ڈیوڑھی کے کونے میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا + جب روتے روتے آنکھوں میں آنسو نہ رہے۔ تو اُٹھ کر مٹکے کی طرف گیا۔ کہ خون آلودہ کُرتا ذرا دھولوں۔ مگر مٹکے میں ایک بوند پانی کی نہ تھی۔ بدقسمتی سے میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی۔ کہ کنوئیں میں سے ڈول نکال لوں + گھر میں اُس وقت کوئی مرد نہ تھا۔ صرف عورتیں تھیں۔ اس لئے مجھے کسی نے منع نہ کیا + خیال فرمائیے۔ ۹ برس کی عمر میں کنوئیں سے ڈول نکالنے گیا۔ جس وقت میں نے کنوئیں میں ڈول لٹکایا۔ اور اُسے بھر کر چاہا۔ کہ کھینچوں۔ میرا پاؤں پھسلا۔ اور رسّی کے جھٹکے کے ساتھ میں بھی ڈول کی طرح قلابازیاں کھاتا ہوا کنوئیں میں گر پڑا۔

کنوئیں میں گرتے ہی دو منٹ کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ مگر اتنا مجھے یاد ہے۔ کہ میرے گرنے سے جو آواز آئی۔ اُس سے عورتیں خبردار ہو گئیں۔ اور چیخیں مارتی ہوئی کنوئیں کے اِردگرد جمع ہو گئیں۔

میں حیران ہوں۔ کہ کیوں میں کنوئیں سے زندہ نکلا + اے میرے اللہ کنوئیں میں گرتے ہی میرا بھیجا کیوں نہ نکل پڑا؟ کیوں میرا دماغ پاش پاش نہ ہو گیا؟ کیوں میں دنیا میں صدمے اور غم سہنے کے لئے

زندہ رہا۔ کاش اُس کنوئیں میں کوئی اژدہا ہوتا۔ جو مجھے نوالہ کر جاتا +
اژدہا کا ہونا ناممکن تھا۔ مگر کنوئیں میں سانپ اکثر ہوتے ہیں۔
کاش اُس جگہ بھی سانپ ہوتا۔ اور مجھے ڈس کر اس عذاب کی زندگی
سے نجات دیتا +

لوگ کہتے ہیں۔ کہ جوان مرنا بہت بُرا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں۔ کہ
خوش قسمت ہیں۔ وہ بچے جو بچپن میں ہی زمانے کی آفتوں اور دنیاوی
مصیبتوں سے بچ کر سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں
کہ بچّوں کے مرنے سے والدین کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ اکثر مائیں
سڑان ہو جاتی ہیں + اکثر باپ اس صدمۂ جانکاہ کو برداشت
نہیں کر سکتے۔ مگر وہ بچے جن کی قسمت میں جوان ہو کر سُکھ پانا نہیں
لکھا۔ اور جنہیں بڑے ہو کر در در کے دھکے کھانے ہیں۔ اگر جوان
نہ ہوں۔ اور بچپن میں ہی ایسی زندگی کی قید سے جو مرنے سے ہزار
درجے بدتر ہے۔ آزاد ہو جائیں تو اچھا ہے +

جس وقت میری آنکھ کھُلی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ چارپائی پر پڑا
ہوں۔ ایک عورت سرہانے بیٹھی کپڑا ہلا رہی ہے۔ ابّا جان مونڈھے
پر بیٹھے نبض دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ کہ اُف اُف کیسا سخت بخار ہے۔
ایک سو چار درجے ہے۔ بدن کو ہاتھ لگانے سے ہاتھ جلا جاتا ہے +
یہ سُن کر میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور بے ہوش گیا + مجھے خبر

نہیں۔ کہ کون دوا پلاتا تھا۔ اور کون غذا کھلاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں۔ کہ میرا معالج کون تھا۔ اور کون میری بیماری میں رات کو جاگتا تھا۔ اتنا مجھے یاد ہے۔ کہ کبھی میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ اور کبھی پھر بیہوش ہو جاتا تھا۔ اکیسویں دن بخار کا یہ زور ہوا۔ کہ سب میری زندگی سے ناامید ہو گئے۔ سب کو میری جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر یہ زور بخار کا آخری زور تھا۔ سر شام مجھے پسینہ آنا شروع ہوا۔ اور ذرہ سی دیر میں لحاف اور توشک دونوں تر ہو گئے۔ اور بخار پسینے کے ساتھ پانی ہو کر بہہ گیا۔

اگرچہ بخار اُتر گیا۔ مگر ضعف انتہا کا تھا۔ بدن میں خون کا نشان نہ تھا۔ صرف چمڑا اور ہڈی باقی رہ گئے تھے۔ میری شکل دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ میں اپنے آپ کروٹ نہیں بدل سکتا تھا۔ ناتوانی سے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ کئی دن تک یہ حالت رہی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے تک مجھ میں اتنی توانائی بھی نہ آئی۔ کہ میں بات کر سکتا۔ مرغ کی یخنی اور گائے کا تازہ دودھ میری غذا تھی۔ میری خالہ جس نے چالیسویں تک رہنا منظور کر لیا تھا۔ میری بیماری کے باعث اَور ٹھیر گئی۔ اور وہی بےچاری میری زندگی کا باعث ہوئی۔ تین مہینے صاحب فراش رہ کر میں اس قابل ہُوا۔ کہ لکڑی کے سہارے اُٹھ کر چلنے لگا اور اکثر دوپہر کو ڈیوڑھی کے باہر دھوپ میں جا بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ میں کھڑا ہُوا دھوپ سیک رہا تھا۔ کہ دُور سے شور و غل کی آواز سنائی دی۔ اور رفتہ رفتہ وہ شور و غل قریب قریب آنے لگا۔ پھر میں نے دیکھا۔ کہ ایک دیوانہ کُتا مُنہ پھیلائے دَوڑا آتا ہے۔ اور اس کے پیچھے بہت سے جوان مرد لکڑیاں اور اینٹیں لئے آتے ہیں۔ یہ کتا مُنہ پھیلائے میرے پاس سے گزرا۔ اور چونکہ مجھ میں اس قدر طاقت نہ تھی۔ کہ ایک طرف ہو جاؤں۔ یا بھاگ کر مکان کے اندر جاؤں۔ کتے نے مُنہ پھیلا کر مجھ پر حملہ کیا۔ قریب تھا کہ میری ٹانگ پر زخم کاری لگائے۔ کہ میری خوش قسمتی کہو یا بدبختی سے ہمارا بھنگی جو ایک موٹے اور لمبے بانس سے موری صاف کر رہا تھا۔ ہمارے مکان کی ڈیوڑھی سے نکلا۔ اور اُس نے کُتے کو اُسی بانس سے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ اتنے میں وہ لوگ جو لاٹھیاں لئے ہوئے اُس کے پیچھے آ رہے تھے۔ وہاں آ گئے۔ اور اُنھوں نے اُس دیوانے کُتے کو تکا بوٹی کر دیا۔ اگرچہ اس موقعہ پر پھر میری جان بچ گئی۔ مگر اس دھکم دھکا میں مَیں جو لاٹھی کی مدد سے چلتا پھرتا تھا۔ زمین پر گر پڑا۔ اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ یہ اَور آفت تھی۔ جو میرے سر پر آئی۔ پھر مجھ کو اُٹھا کر گھر لے گئے۔ اور میں پھر بستر بیماری پر تصویر نہالی کی طرح لیٹ گیا۔

ناظرین میں آپ سے یہ کہنا بھول گیا۔ کہ میرا والد انتہا کا کنجوس

اور بخیل تھا۔ تلوں سے تیل نکالتا تھا۔ اور کوڑی کوڑی پر جان دیتا تھا
میری اس بیماری پر اُس کو خواہ مخواہ روپیہ خرچ کرنا پڑا تھا۔ جس
وقت میں دوبارہ گر پڑا۔ اور گرنے سے میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ تو
بجائے اس کے کہ وہ میری ردی حالت پر آنسو بہاتا۔ میری
ٹانگ ٹوٹی ہوئی دیکھ کر بے قرار ہوتا۔ وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اور
اس قدر غضب ناک ہُوا۔ کہ غصّے کی حالت میں میری مری ہوئی
والدہ کو بھی بہت بُرا بھلا کہا۔ اور اگر میں سخت نازک حالت میں نہ
ہوتا۔ تو مجھ کو ضرور ہی مارتا۔ غرض میرا والد نہایت ہی چڑ چڑ ہُوا۔ بار
بار مجھے گالیاں دیتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ کم بخت تو مکان سے باہر
ہی کیوں گیا تھا؟ اب تیری یہ سزا ہے۔ کہ تجھے کُھجلی والے کُتّے کی
طرح کُوڑی پر پھینک دیا جائے۔

لوگو میری اس تحریر سے متعجب نہ ہونا۔ دنیا میں ہر طرح کے
باپ ہوتے ہیں۔ خدا نے پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں کیں۔ ایسے
باپ بھی ہوتے ہیں۔ کہ اولاد پر جان دیتے ہیں۔ لڑکا چاہے کتنا
ہی ناخلف ہو۔ مگر باپ کی محبت میں فرق نہیں آتا۔ بعض باپ
ایسے ہوتے ہیں۔ کہ لایق اور زردار اولاد کے گاہک ہوتے ہیں۔
اور بے زر اولاد کو عاق کر دیتے ہیں۔ بعض باپ ایسے ہوتے ہیں۔
کہ بچپن میں تو اپنی اولاد کو جان کے برابر سمجھتے ہیں۔ مگر جب اولاد

مانند پرندوں یا جانوروں کے ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا
کہ جانور اپنے بچوں کو کس طرح پالتے ہیں۔ چڑیا کس طرح بچوں کو
پوٹے سے دانہ نکال کر کھلاتی ہے۔ اور بندریا کس طرح بچے کو ہر
دم کلیجے کے ساتھ لگائے رہتی ہے۔ پھر کیا آپ نے نہیں دیکھا
کہ وہی بچے جب جوان ہو جاتے ہیں۔ تو چڑیاں انہیں پر مار مار
کر گھونسلے سے نکال دیتی ہیں۔ اور بندریا جس بچے کو چھاتی کے
ساتھ لگائے رہتی تھی۔ پھر اس کو کاٹنے دوڑتی ہے۔ وہ باپ بھی
ہیں۔ جو اپنے بچوں سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں۔ کہ
یہ دنیا کے پردے سے اٹھ جائیں :

تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بعضے باپ جو بادشاہ وقت تھے۔
اپنی اولاد سے بدظن ہو گئے۔ اور ان کو یا تو قتل کروا دیا۔ یا تمام عمر
ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالے رکھیں + مطلب میرا اس تحریر
سے یہ تھا۔ کہ میرا باپ جس کی میرے دل میں بڑی محبت تھی۔
انوکھا باپ تھا + شفقت پدری اس میں بہت کم تھی۔ بلکہ کئی دفعہ
مجھے یہ گمان ہوتا تھا۔ کہ وہ مجھے بار خاطر یا درد سر سمجھتا ہے + بہر
حال اس میں تو مطلق شک نہیں۔ کہ اگر میری محبت میرے والد
بزرگوار کے دل میں تھی۔ تو صرف اس وقت تھی۔ جب تک میری

والدہ ماجدہ زندہ تھی۔ جس وقت میری والدہ کی آنکھیں بند ہوئیں وہ محبّت کافور کی طرح اُڑ گئی ۔

میری حقیقی خالہ جو میری پہلی بیماری میں میری خدمت کرتی تھی۔ اور جس نے میرے لئے یا اپنی مری ہوئی بہن کے لئے کھانا پینا اور سونا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اب وہ میرے پاس نہ تھی۔ کہ میری خبرگیری کرتی۔ اس لئے میں ایک ٹوٹی ہوئی چوکی کی طرح ایک کونے میں پڑا تھا۔ اور کوئی ایسا نہ تھا۔ کہ مجھے اُٹھا کر پیشاب کرائے۔ یا مجھے تسلّی دے ۔ میرے والد بزرگوار دو وقت گھر میں آتے تھے۔ تو بجائے میری دل جوئی کرنے کے مجھے صلواتیں سُنا کر جاتے تھے ۔

اس دوسری بیماری میں کسی نے میری پروا نہ کی۔ نہ کوئی ڈاکٹر بلوایا گیا۔ نہ کوئی حکیم آیا۔ ایک نیم حکیم دوسرے تیسرے دن آتا تھا۔ اور پٹی کو جو اُس نے باندھی تھی۔ دیکھ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ میری ٹانگ جو اگر کسی لائق جرّاح یا قابل ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہوتی۔ تو ضرور مہینے ڈیڑھ مہینے میں اچھی ہو جاتی۔ اب کہیں چھ مہینے میں جا کر اچھی ہوئی۔ اور چھ مہینے تک جو تکلیف مجھے ہوئی وہ میرا ہی دل جانتا ہے ۔ میری تکلیف کا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے۔ جو ہمیشہ تندرست رہتے ہیں۔ اور جن کو بیماری سے واسطہ نہیں

دیا۔ ہاں وہ جن کی صحت اچھّی نہیں ہے۔ بتا سکتے ہیں۔ کہ چھ مہینے تک چارپائی پر پڑا رہنا کس قدر دشوار اور ناگوار ہے + ایک ایک دن مجھے پہاڑ کی طرح کاٹنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اور ایک ایک رات مجھے عذاب قبر سے بدتر تھی۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ میری عمر ابھی دس سال سے زیادہ نہ تھی ٭

باب سوم

آبیاری ابرِ رحمت نے نہ کی اب کے برس
مزرعِ اُمیّد اپنی خشک بے پانی ہوئی

ابھی تک تو میری قسمت میں پدر بزرگوار کی ہی گالیاں اور جھڑکیاں لکھی تھیں۔ جس وقت میری والدہ کو جنّت نصیب ہوئے ایک سال ہوا۔ تو میری بدنصیبی نے اَور نیا گُل کھلایا + ابّا جان نے دوسری شادی کرلی + یہ عورت بیوہ تھی۔ اور ذات کی پٹھانی تھی۔ اور نام گُل جان تھا + اب میری عمر قریب چالیس سال کی ہے۔ اور گُل جان کو دیکھے مجھے عرصہ گزرا۔ لیکن اب بھی جب مجھے اس کا

خیال آتا ہے۔ تو میں کانپ جاتا ہوں + گُل جان عورت نہ تھی + ایک خونخوار دیونی تھی + اُس کا دل پتھّر کا تھا۔ اور رحم اُس کی شکل سے کوسوں بھاگتا تھا + ناظرین اس عورت نے مجھ پر سخت ظلم اور ستم کئے۔ ایسی ایسی اذیتیں اس سوتیلی والدہ نے مجھے دیں۔ کہ اگر میری قسمت میں در در کے دھکّے کھانے اور آوارۂ وطن ہونا نہ لکھا ہوتا۔ تو کبھی ان تکلیفوں کو برداشت نہ کرتا۔ اور ضرور مرجاتا +

گُل جان ذات کی پٹھانی تھی۔ اور بلا کی شکم پرور عورت تھی۔ صبح جب اُٹھتی۔ تو بازار سے آدھ سیر ملائی منگا کر چائے اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھی۔ ایک پیالہ آپ پیتی تھی اور ایک آبا جان کو دیتی۔ میں پاس بیٹھا ترستا رہتا تھا۔ مگر کیا مجال جو ایک قطرہ چائے کا مجھے دیا جائے +

ایک دن کا ذکر ہے۔ آبا جان چائے پی کر دُکان پر گئے۔ اور گُل جان کوٹھے پر گئی۔ میں نے وہ خالی پیالی چائے کی جس میں شاید دو یا تین قطرے چائے کے ہوں گے۔ اُٹھا کر مُنہ سے لگالی + میری بدقسمتی سے ابھی میں پیالی چاٹ رہا تھا۔ کہ اوپر سے گُل جان آ گئی۔ پیالی میرے ہاتھ دیکھ کر آگ بھبوکا ہوگئی۔ بجلی کی طرح کڑکی اور بادل کی طرح گرجی۔ اور ایک دوہتّڑ اس زور سے مجھے جڑی کہ میں مُنہ کے بل گرا۔ اور میرے دانتوں سے لہو نکلنے لگا +

ملائی والی چائے تو صبح کا ناشتا تھا۔ دس بجے سیر بھر گوشت کا پلاؤ پکتا تھا۔ تیسرے پہر بازار سے مٹھائی آتی تھی۔ اور فصلی میوہ منگایا جاتا تھا۔ اور شام کو نہایت لذیذ کباب اور مرغن پراٹھے گھی میں تلے جاتے تھے۔ مگر مجھے سوائے دو سوکھی چپاتیوں کے اور کچھ نہ ملتا تھا۔ میرا پیٹ دو چپاتیوں سے نہ بھرتا تھا۔ مگر اس قدر مجال نہ تھی۔ کہ اور مانگوں۔ یا ابا جان سے شکایت کروں۔ ابا جان ہمیشہ گل جان کی طرف داری کرتے تھے۔ اور مجھے اس طرح پر جھڑک دیتے تھے۔ جیسے میں انسان نہ تھا۔ کھجلی مارا کتا تھا۔

جب گل جان سیب یا ناسپاتی بازار سے منگاتی تھی۔ تو اس کی نظر بچا کر سیب کے چھلکے میں کھایا کرتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا۔ جس دن مجھے مار نہ پڑے۔ اگر میں صبح بہت سویرے نہ اٹھوں تو مجھے مار پڑتی تھی۔ اگر میں گل جان کے حکم کی تعمیل میں ایک لحظے کی دیر کروں۔ تو مجھے مار پڑتی تھی۔ اگر جلدی بازار سے سودا سلف نہ لاؤں۔ تو مار پڑتی تھی۔ اگر گل جان کو حقہ تازہ کر کے نہ دوں۔ تو مار پڑتی تھی۔ اگر اس کے پاؤں نہ دباؤں۔ تو مار پڑتی تھی۔ اس گھر میں میری حیثیت ایک خدمت گار جیسی بھی نہ تھی۔ خدمت گار کو تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے کوڑی نہ ملتی تھی۔ اور کام اس قدر کرنا پڑتا تھا۔ کہ جب رات کو میں چارپائی پر لیٹتا تھا۔ تو میرا بند بند دکھتا تھا

اور میں بے ہوش ہو جاتا تھا +

ایک دفعہ ابا جان امرتسر گئے۔ اور میں اور گل جان گھر میں اکیلے رہ گئے + جب رات کے نو یا دس بجے۔ تو میں حسب معمول چارپائی پر جا کے لیٹا + اس دن اتفاقاً میرے سر میں شدت سے درد ہو رہا تھا۔ ابھی مجھے لیٹے آدھا گھنٹہ گزرا۔ تو گل جان نے مجھے پکارا:۔

گل جان۔ سردار ابھی سے مر گیا؟

میں۔ ہوں! ہوں!!

گل جان۔ اے موذی یہ ہوں ہوں کیسی؟

میں۔ (جاگ کر) ہاں اماں جان +

گل جان۔ ابھی سے مر گیا؟

میں۔ میں جاگتا ہوں +

گل جان۔ پھر بولتا کیوں نہیں؟

میں۔ سر میں بہت درد ہے +

گل جان۔ کیا چولھے میں تیرا سر +

میں۔ کیا کہتی ہو؟

گل جان۔ جب دیکھو۔ بہانہ ہی بناتا رہتا ہے +

میں۔ میں حاضر ہوں۔ کام فرمائیے +

گل جان۔ جی چاہتا ہے۔ کہ منہ جھلس دوں موئے کا +

میں۔ ناحق خفا ہو رہی ہو۔

گُل جان۔ اِدھر آ۔ پاؤں دبا۔

میں۔ اچھّا آیا۔

اس وقت درد کی شدّت سے میرا سر پھٹا جاتا تھا۔ اور آنکھیں زبردستی بند ہوئی جاتی تھیں۔ جی مالش کر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں ست نہ تھا۔ مگر چار ناچار اُٹھا ایک صافی سے اپنے سر کو کس کر باندھا۔ اور جا کر اُس سنگ دل عورت کے پاؤں دبانے لگا۔ اُس وقت چونکہ مجھے تکلیف تھی۔ میں اچھّی طرح پاؤں نہ دبا سکا۔ اس عورت کو میرے اس اوپرے دل سے کام کرنے پر سخت غصّہ آیا۔

گُل جان۔ او شیطان کیا ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں؟

میں۔ میں تو دبا رہا ہوں۔

گُل جان۔ پاؤں اس طرح دبائے جاتے ہیں؟

میں۔ اور کس طرح دباؤں؟

گُل جان۔ زور سے دباؤ۔

میں۔ جتنا زور ہو اتنا ــــــ

گُل جان۔ بس نابکار! مجھ سے باتیں نہ بنا۔ وہی مثل ہوئی۔ ننھّی سی جان اور گز بھر کی زبان۔

میں۔ امّاں جان۔

گُل جان - گئی چُولھے میں تیری آماں - میں تیری آماں کیوں ہونے لگی تھی ؟

میں - ہائے اللہ میں کیا کروں ؟

گُل جان - کرنا کیا ؟ زور سے پاؤں دبا ؛

میں - یہ لو - اور کس طرح دباؤں ؛

گُل جان - میں بتاؤں تجھے !

میں - میرے اللہ میں کہاں جاؤں ؟

گُل جان - ٹھیر جا - بتاتی ہوں ؛

یہ کہہ کر وہ خون خوار عورت اُٹھی - اور مجھے اَوندھا لٹا کر میرے دونوں ہاتھ پلنگ کی پائینتی کے دونوں پاؤں کے نیچے دے دیئے اور ایک بانس کی چھڑی ہاتھ میں لے کر آپ اُس پلنگ پر ہو بیٹھی جس وقت میں ہائے کرتا تھا - یا مُنہ سے بولتا تھا - اوپر سے وہ چھڑی میرے بدن پر برسنے لگتی تھی ؛

میں - ہائے میری آماں میں مرا ؛

گُل جان - اب آماں اللہ ماری چھچل پیری یاد آئی ؟

میں - ہائے میری جان نکلی !

گُل جان - بلا سے ؛

میں - خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو ؛

گُل جان۔ چُپ۔ چُپ۔ چُپ!
میں۔ ہائے میرے ہاتھ کٹ گئے!
گُل جان۔ اِن ہاتھوں میں تو ست نہ تھا؟
میں۔ ہائے میری اُنگلیاں ٹوٹ گئیں!
گُل جان۔ یہ اُنگلیاں آگ میں جلانے کے قابل ہیں۔
میں۔ اب میں کبھی سونے کا نام نہیں لوں گا۔
گُل جان۔ تو بڑا شریر ہے۔
میں۔ ہائے ہائے مجھے قے آتی ہے۔ اب کبھی نہیں اونگھوں گا۔
گُل جان۔ پھر وہی بہانہ؟
میں۔ بہانہ نہیں کرتا۔ مجھے سچ مچ قے آتی ہے۔
گُل جان۔ کتّے موذی۔ کیوں بہانے بناتا ہے۔
میں۔ ہائے کوئی مجھے بچائیے۔
گُل جان۔ خبردار۔ جو مُنہ سے آواز نکلی۔ ابھی زبان گدّی سے نکال ڈالوں گی۔
میں۔ اجی میں تمام رات تمہارے پاؤں دباؤں گا۔ خدا کے واسطے ایک دفعہ میرے ہاتھ چھوڑ دو۔
گُل جان۔ اور جو پھر اونگھا تو پھر؟
میں۔ جو مرضی چاہے کرنا۔

میرے سر میں درد تھا۔ جی متلاتا تھا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا بھلا میں پاؤں کیا دباتا؟ جس وقت اس سنگ دل ظالم سوتیلی والدہ نے میرے دونوں ہاتھ پلنگ کے نیچے دے دیئے۔ اور اوپر آپ باایں ہمہ تن و توش چڑھ کر بیٹھ گئی۔ تو مجھے سخت ہی تکلیف ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میری انگلیاں چکی کے پاٹ کے نیچے پسی جا رہی ہیں۔ میرا کلیجہ بلبوں اچھل رہا تھا۔ اور تمام بدن میرا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ تک ایسی حالت میں رہا۔ مگر اس حالت کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ ناظرین آپ نہیں کر سکتے ہیں ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ مے دانی

طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپارا

غرض خدا خدا کرکے اس آفت جان نے میری خلاصی کی۔ مگر یہ خلاصی برائے نام تھی۔ کیونکہ پھر وہ کشمیری شال لے کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اور مجھے نادری حکم دے دیا۔ کہ جب تک اس بندی کو نیند نہ آئے۔ پاؤں دباتا رہ۔ قہر درویش برجان درویش۔ جس طرح وہ کہتی تھی۔ اسی طرح میں کرتا تھا۔ ڈر بری چیز ہے۔ اس خون خوار عورت کے ڈر سے میری نیند کافور ہو گئی۔ اور سر درد بھی ہوا ہو گیا۔ جس وقت پاؤں دباتے دباتے میں تھک جاتا تھا۔ اور اپنے خیال میں سمجھتا تھا۔ کہ وہ سو گئی۔ اور ذرا ہاتھ ڈھیلے کرتا

تھا۔ تو وہ فوراً کھانستی تھی۔ اور کروٹ بدلتی تھی۔ اُس کے کھانسنے کی آواز سے میں فوراً چوکنا ہو جاتا تھا۔ اور پھر زور زور سے پاؤں دبانے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ اسی طرح رات کے بارہ بج گئے۔ جب ایک کا عمل ہُوا۔ تو گُل جان نے آنکھیں کھول دیں۔ اور مجھ سے یوں بولی :۔

گُل جان۔ سردار!

میں۔ جی اماں جان :۔

گُل جان۔ ابھی تو جاگتا ہے ؟

میں۔ آپ نے جو حکم دیا تھا :۔

گُل جان۔ اچھا حقّہ تازہ کر کے ہمیں لا دے۔ اور جا کر سو رہو :۔

میں۔ بہت اچھا :۔

گُل جان۔ پہلے چراغ میں تیل ڈال۔ دیکھ بُجھنے لگا ہے :۔

میں۔ تیل کہاں ہے ؟

گُل جان۔ میرے مُنہ میں۔ کم بخت لڑکا۔ جا خود تلاش کر۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے ؟

میں نے تیل کی بوتل تلاش کر کے چراغ میں تیل ڈالا۔ اور پھر چلم بھری۔ حقّہ تازہ کیا۔ اور اُس عورت کے سامنے لا رکھا :۔

میں۔ اب سو رہوں :۔

گُل جان۔ کیا بجا ہو گا؟
میں۔ ایک بجنے والا ہے۔
گُل جان۔ اچھا جا سو رہو۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔
میں۔ وہ کیا بات ہے۔ فرمائیے؟
گُل جان۔ صبح پانچ بجے اُٹھ کر پانی گرم کر رکھنا۔ کل جمعہ ہے میں غسل کروں گی۔
میں۔ بہت اچھا۔
گُل جان۔ میں ٹھیک چھ بجے نہاؤں گی۔ اُس وقت تک پانی گرم نہ ہُوا۔ تو پھر تجھے چُولھے میں جھونک دوں گی۔
میں۔ چار بجے ہی پانی چُولھے پر رکھ دوں گا۔
گُل جان۔ اب جا سو رہو۔
میں۔ بہت بہتر۔ آداب عرض ہے۔

ابھی میں چارپائی پر جا کر لیٹا ہی تھا۔ اور کمر تک سیدھی نہ ہوئی تھی۔ کہ گُل جان پھر گالیاں بکنے لگی۔ اور مجھے سخت و سُست کہنے لگی۔ لحظہ بہ لحظہ اُس کا غصّہ زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اور میں اپنے بستر میں بید مجنوں کی طرح پڑا کانپ رہا تھا۔ آخر وہ چلّا کر بولی۔
گُل جان۔ او ناشدنی!
میں۔ حاضر اماں جان!

گُل جان۔ اِدھر تو آ۔ پر وار سانپ ۔

مَیں۔ (کانپ کر) حکم؟

گُل جان۔ اِس حُقّے میں کیا ڈال دیا ہے؟

مَیں۔ کچھ نہیں ۔

گُل جان۔ معلوم ہوتا ہے۔ تو میرا دشمن ہے ۔

مَیں۔ توبہ توبہ خدا نہ کرے ۔

گُل جان۔ ابے سچ بتا اس چلم میں زہر بھر دیا ہے۔ کہ سنکھیا ڈال دیا ہے؟

مَیں۔ (ڈر کر) میں نے تو آپ کے سامنے تماکو بھرا ہے ۔

گُل جان۔ نہیں اس میں سے یہ دھواں کیسا نکل رہا ہے؟

مَیں۔ اب مجھے کیا خبر؟

گُل جان۔ اودھر آ ۔

مَیں۔ میں تو سامنے حاضر ہوں ۔

گُل جان۔ جلدی چراغ لا ۔

مَیں۔ بے شک دیکھ لو ۔

گُل جان۔ میرے مُنہ کا ذائقہ بھی بدل گیا ہے ۔

مَیں۔ (چلم اُلٹ کر) دیکھ لو ۔

گُل جان۔ او تیرا ستیاناس اب میں سمجھی ۔

میں ۔ کچھ میرا قصور بھی بتاؤ ؟
گُل جان ۔ اِس تمبا کو میں تو نے تیل کا ہاتھ لگا دیا ہے ۔
میں ۔ معاف کیجیے ۔ میں نے جان کر ایسا نہیں کیا ۔
گُل جان ۔ نہیں تُو جان کے بجھے دق کرتا ہے ۔ تو سخت نٹ کھٹ ہے ۔
میں ۔ میری کیا مجال ہے ۔ جو آپ کو دق کروں ۔
گُل جان ۔ تیرے ہاتھ سے میں بہت ست گئی ہوں ۔ یا اس گھر میں تُو رہ ۔ یا میں رہوں ۔ میرا مغز کُتّے کا نہیں ہے ۔ کہ ہر وقت تیرے ساتھ مغز زنی کروں ۔
یہ کہہ کر اُس ستم پیشہ عورت نے چراغ میرے ہاتھ سے لے لیا ۔ اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر چراغ کی لَو سے میرے کُرتے کو آگ لگا دی ۔ میں ہر چند کودا ۔ اُچھلا ۔ مگر اُس کے ہاتھ خاصے زنبور ۔ یا شکنجہ تھے ۔ میں چھُوٹ نہ سکا ۔ جب چاروں طرف سے مجھے آگ کے شعلوں نے گھیر لیا ۔ اور میری پیٹھ اور پیٹ جلنے لگا ۔ تو اُس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے ۔ اور میں زمین پر مُرغ نیم بسمل کی طرح لوٹنے اور تڑپنے لگا ۔ اور بے ہوش ہو گیا ۔

باب چہارم

ہم تری بزم سے اے یار چلے جاتے ہیں

لے چلے جاتے ہیں - لاچار چلے جاتے ہیں

مجھے یاد ہے - جب مجھے ہوش آیا - تو میں چار پائی پر پڑا تھا + میرے والد میرے سرہانے کھڑے تھے - اور میرے پیٹ اور پیٹھ پر آبلے پڑے ہوئے تھے - میں نے چاہا - کہ اپنے والد سے کچھ کہوں - مگر گل جان آ گئی - اور مجھے طاقت گفتار نے جواب دے دیا + میں نے حسرت بھری نگاہ سے اپنے والد کی طرف دیکھا - اور رونے لگا + میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری دیکھ کر گل جان نے آنکھیں سرخ کریں - اور اس طرح مجھے گھورا - کہ جیسے ابھی نوالہ کر جائے گی +

گل جان - یہ لڑکا بڑا ہی شوخ ہے !

والد - بے شک شریر ہے +

گل جان - اب روتا ہے ؟

والد - اب رونے سے کیا فائدہ ؟ پہلے کیوں آگ سے کھیلنے لگا

[illegible]

کہ چراغ کے پاس نہ بیٹھ۔ اس نے ایک نہ سُنی ؞

والد۔ اب جل گیا نہ کم بخت کو لال ٹکا ؞

گُل جان۔ جھاڑو کے تِنکے جلاتا تھا۔ اور ہاتھ میں لے کر ہلاتا تھا ؞

والد۔ میں اس لڑکے کے ہاتھ سے بہت تنگ آگیا ہوں ؞

گُل جان۔ خدا جانے یہ کس پر گیا ہے ؟

والد۔ اب اس کا کیا علاج کروں ؟

گُل جان۔ آپ ہی اچھا ہو جائے گا ؞

والد۔ نہیں علاج کرانا چاہئے۔ میں جرّاح کو بُلاتا ہوں ؞

گُل جان۔ اے ہے تمہارا پیسہ حرام کا آیا ہے۔ ناحق جرّاح کو ایک دو روپے دینے پڑیں گے ؞

والد۔ پھر کیا کریں۔ لاچاری ہے ؞

گُل جان۔ تمہارے لاڈ نے ہی تو اس لڑکے کو بگاڑا ؞

والد۔ آخر اس حالت میں تو اسے چھوڑا نہیں جا سکتا ؞

گُل جان۔ جب تک یہ اذیّت نہیں اُٹھائے گا۔ باز نہیں آئے گا ؞

والد۔ اگر اس حالت میں رہا۔ تو مر جائے گا ؞

گُل جان۔ اجی توبہ کرو۔ توبہ ؞

والد۔ نظام الدین جراح کو بُلاتا ہوں۔ وہ فیس بھی نہیں لے گا۔ اور مفت علاج کرے گا ؞

گُل جان۔ ہاں کسی ایسے حکیم کو لے آؤ ؞

والد۔ امید نہیں۔ کہ نظام دین ہم سے کچھ لے ؞

گُل جان۔ لیتا کیا۔ تم کہہ دینا۔ کہ ہمارا ملازم بیمار ہے ؞

میرے قبلہ گاہ گئے۔ اور حکیم نظام الدین کو بُلا لائے۔ حکیم نے میٹھے تیل اور رال میں کوئی دوا ملائی۔ اور میرے بدن پر جہاں جہاں آبلے پڑے تھے۔ لگا دی ؛ جس وقت حکیم جی جانے لگے۔ تو میرے والد نے ایک روپیہ نذر کیا۔ اور حکیم صاحب نے کچھ اصرار انکار کے بعد قبول کیا ؛ اس دوا کے لگتے ہی میرے زخموں میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اور سوزش اور جلن یک قلم موقوف ہو گئی ؞

حکیم صاحب کے جانے کے بعد جب میری والدہ کو معلوم ہوا کہ حکیم کو ایک روپیہ دیا ہے۔ تو اُس نے گھر سر پر اُٹھا لیا ؛ مجھے ہزاروں بے نقط گالیاں دیں۔ اور لاکھوں صلواتیں میرے پدر بزرگوار کو سنائیں ؛ کہنے لگی۔ کہ جب اس طرح روپیہ ضائع کرتے ہو۔ تو میری بلا کو غرض پڑی ہے۔ کہ میں کفایت شعاری کروں۔ تم تو بوڑھے ہو۔ اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو۔ ایک دو سال میں ڈھلک جاؤ گے۔ پیچھے میں کیا کروں گی۔ اور کس طرح عمر

بسر کروں گی؟ مجھے اس قسم کی فضول خرچی اور فیاضی ایک آنکھ
نہیں بھاتی۔ اگر تم اس طرح گھر اجاڑنا چاہتے ہو۔ تو میرا حق مہر
میرے حوالہ کرو۔ اور پھر میری طرف سے دیا سلائی لگا دو۔ گھر
میں جھاڑو پھیر دو۔ واہ یہ بھی اچھی بات ہوئی *

میرے والد وہی شیخ قلندر بخش تھے۔ جو ذرا سی بات
پر میری جنت نصیب والدہ کو آٹھ آٹھ آنسو رلایا کرتے تھے۔ جو
معمولی سی بات پر ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے۔ جو کھانا
وقت پر نہ پکنے سے گھر سر پر اٹھا لیا کرتے تھے۔ مگر اس پٹھانی
کے کچھ ایسے مرید ہوئے تھے۔ کہ کیا مجال کہ اس کو کسی بات کا
الٹ کر جواب دے جائیں۔ گالیاں کھاتے تھے۔ اور ہنستے جاتے
تھے۔ اب جب کبھی مجھے اس بات کا خیال آتا ہے۔ تو میں سخت
حیران ہوتا ہوں۔ کہ یہ کیا معاملہ تھا۔ حسن و جمال میں گل جان
کو میری والدہ سے کچھ نسبت نہ تھی۔ میری والدہ خوب صورت
کامنی سی عورت تھی۔ گل جان نہایت بھدی بیسل۔ فیل قامت عورت
تھی۔ میری والدہ کم سخن بے زبان تھی۔ گل جان بدلگام کلہ دراز
تھی۔ میری والدہ رحم دل اور بردبار تھی۔ گل جان سنگ دل
سفاک اور کینہ ور تھی۔ قصہ مختصر میری والدہ حور تھی۔ تو یہ غول
بیابانی۔ پھر تعجب ہے۔ کہ میرے والد کیوں میری والدہ کو تنگ

کیا کرتے تھے۔ اور اس حلوفہ کے غلام ہو رہے تھے + مگر یہ بات پروردگار ساز ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔ کہ حسین اور مہ جبین عورتیں گلیوں میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور کالی کلوٹی ہنگن لوٹی سونے میں پیلی ہو رہی ہیں + ہم نے دیکھا ہے۔ کہ جاہل اور بے علم صاحب مال و منال ہیں۔ اور عالم و فاضل نان شبینہ کو محتاج ہیں ٭

بہ نادان آن چنان روزی رساند

کہ دانا اندر ان حیران بماند

اس راز کا سمجھنا مشکل ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ شان خدا سے وہی شیخ قلندر بخش جن کا غصہ ضرب المثل تھا۔ اور جن کی بدمزاجی شہرۂ آفاق تھی۔ اس پٹھانی کے آگے بھیگی بلّی بنے بیٹھے تھے ٭

گُل جان بکتی جھکتی رہی۔ اور یہ چپکے بیٹھے سُنا کئے + آخرکار یہ شتر کینہ عورت بک جھک کر خاموش ہو رہی۔ مگر اُس دن کے بعد ابا جان کو اس قدر جسارت نہ ہوئی۔ کہ پھر کسی حکیم صاحب کو بُلا کر لائیں۔ یا مجھے دکھائیں۔ وہی مرہم جو وہ بنا کر دے گیا تھا۔ میں ہر روز زخموں پر لگایا کرتا تھا۔ اور چارپائی پر پڑا دعائیں مانگا کرتا تھا۔ کہ یا الٰہی میرے زخم جلدی اچھے نہ ہوں۔ کیونکہ اس وقت گھر کے کام دھندے اور گُل جان کی خدمت گاری سے بچا ہُوا تھا۔ مگر

میری دُعا کو اثر کے ساتھ دشمنی تھی۔ وہ قبول نہ ہوئی۔ اور میں بدقسمتی سے ہفتہ عشرہ میں ہی تندرست ہوگیا ٭

جس دن میں نے غسل صحت کیا۔ اُسی دن سے پھر وہ عورت میرے گلے کا ہار ہوگئی۔ ہر روز اُسی طرح مجھے ستانے لگی۔ اور دق کرنے لگی + ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ دوپہر کے وقت میں سر کے درد کا بہانہ کرکے لیٹا تھا۔ کہ ایک عورت اُس پٹھانی کو ملنے آئی۔ یہ دونو بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اور میں ایک کونے میں سویا ہوا تھا۔ نیند کیا خاک آتی۔ یوں ہی بہانہ کرکے مُنہ ڈھانپے پڑا تھا + اِن دونوں نے مجھے سوتا سمجھ کر باتیں شروع کیں ٭

عورت۔ سُناؤ اب تو اچھی طرح گزرتی ہے ؟

گل جان۔ شکر ہے ٭

عورت۔ تمہارا یہ خاوند تو خوب تابعدار ہے ٭

گل جان۔ ہاں بہت اچھا آدمی ہے ٭

عورت۔ یہ تمہارا چوتھا خاوند ہے۔ چوتھا ہی نا ؟

گل جان۔ خاموش۔ دیوار ہم گوش دارد !!

عورت۔ اب تو تمہیں کسی بات کی شکایت نہیں ؟

گل جان۔ نہیں اَور تو سب معاملہ درست ہے۔ ایک یہ موذی میری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہے ٭

میں ڈال کر اُس کو دے دیا کرنا۔ پھر دیکھ لینا چالیس دن میں کام تمام ہو جائے گا۔ اور زہر خورانی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہو گی۔ چاہے ڈاکٹر کتنا ہی زور لگائیں۔ یہ ہرگز نہیں بتا سکیں گے۔ کہ مریض کو زہر دیا گیا ہے۔ یہ دوا مجھے ایک سادھو سے ملی تھی ؛

گُل جان۔ بہن تم نے تو میری چھاتی سے ایک بڑا بھاری پتھر اُٹھا دیا۔ میں ہر روز بلا ناغہ اُس کو سالن میں کھلا دیا کروں گی ؛

عورت۔ لو اب میں چلتی ہوں۔ اور وہ دوا لاتی ہوں۔ تم اپنے وعدہ پر قائم رہنا ؛

گُل جان۔ خدا حافظ۔ مَیں ایک بار نہیں۔ سَو بار قائم ہوں ؛

تھوڑی ہی دیر میں یہ عورت گُل جان کو ایک پُڑیا دے گئی۔ جو اُس نے اپنے پاس احتیاط سے رکھ لی ؛ میں کونے میں پڑا یہ تمام باتیں سُن رہا تھا۔ اور بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ جب وہ عورت چلی گئی۔ اور گُل جان کسی کام میں مشغول ہوئی۔ تو میں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ مگر نہایت مغموم تھا۔ کہ اب جان کے بھی لالے پڑ گئے ؛ ایک دل میں یہ آتی تھی۔ کہ ابا جان کو اطلاع دوں۔ مگر پھر یہ بات بے سُود اور فضول معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ وہ میری بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ اسی فکر میں شام ہو گئی۔ اُس دن خلاف معمول گُل جان نے مجھے روٹی کے ساتھ سالن

عورت۔ یہ کون ہے؟
گل جان۔ میری سوت کا بیٹا۔
عورت۔ تو کیوں نہیں تم اُس کو ٹھکانے لگاتیں؟ تم بڑی باولی ہو!
گل جان۔ یہ مُوا بڑا سخت جان ہے۔ مرتا بھی تو نہیں!
عورت۔ یہ بیچارہ کس شمار قطار میں ہے۔
گل جان۔ یہ بڑا سخت جان ہے۔ یہ مرجاوے تو تمام مال و اسباب کی میں مالک ہو جاؤں گی۔ بوڑھے قلندر کو تو میں نے خوب ہی تابعدار کر لیا ہے۔ میری اچھی سہیلی کوئی ایسی تجویز بتاؤ۔ جس سے اس لونڈے سے کسی طرح میرا پیچھا چھوٹے۔
عورت۔ یہ کون سی بات ہے۔
گل جان۔ اگر اِس کو کسی طرح دفع کرو۔ تو سَو روپے تمہاری نذر کروں۔
عورت۔ دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔
گل جان۔ جان جائے پر بات نہ جائے۔
عورت۔ میرے پاس ایک ایسی دوا ہے۔ کہ اگر تھوڑی کھانے میں ملا کر کسی کو دی جائے۔ تو چالیس دن میں اُس شخص کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ اور کوئی علامت زہر کی معلوم نہیں ہوتی۔ اس میں نہ کچھ خوشبو ہے۔ نہ اُس کا کچھ ذائقہ ہے۔ میں ابھی وہ دوا لاتی ہوں۔ اس کو لے کر دو رتی کے برابر دونوں وقت سالن

بھی دیا۔ اور کہا۔ کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھا ؏

میں۔ میں سالن نہیں کھاتا ؏

گل جان۔ کیوں ہیضہ ہو جاوے گا؟

میں۔ مجھے سوکھی روٹی کھانے کی عادت ہو گئی ہے ؏

گل جان۔ کیوں رے فتنے! اب مجھے طعنہ دیتا ہے۔ یہ رنگ لائی گلہری ؏

میں مجھے سالن سے معاف رکھو ؏

گل جان۔ نہیں کھانا ہوگا۔ ورنہ جوتیاں پڑیں گی ؏

میں۔ اچھا لاؤ کھاتا ہوں ؏

گل جان۔ نہیں میرے سامنے کھا ؏

میں۔ یہ بھی زبردستی ہے؟

گل جان۔ ہاں زبردستی ہی سہی ؏

حضرات اِس خونخوار عورت نے اپنے سامنے مجھے زبردستی وہ سالن کھلایا۔ کھانا کھانے کے دو تین گھنٹے بعد مجھے میٹھا میٹھا درد پیٹ میں محسوس ہوا۔ مگر اس قدر زیادہ نہ تھا۔ کہ میں بے قرار یا بے چین ہو جاتا۔ علی الصّباح جب سوکر اُٹھا۔ تو میرا کلیجہ دھڑکتا اور دل گھٹا جاتا تھا۔ دوسرے دن مجھے پھر روٹی کے ساتھ سالن ملا۔ پھر تو مجھے یقین ہوگیا۔ کہ اب اِس گھر میں میرا گزارہ نہیں۔ اگر

یہاں رہوں گا۔ تو ضرور مارا جاؤں گا۔ اس لئے میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ تن بہ تقدیر یہاں سے نکل کھڑا ہونا چاہئیے ٭

میرے والد کا خون سفید ہو گیا تھا۔ وہ میری اس قدر بھی پروا نہ کرتے تھے جس قدر بعض لوگ اپنے کتوں کی کرتے ہیں۔ گھر میں سیاہ و سفید کی مالک گل جان تھی۔ وہ میری جان کی بیرن تھی۔ مجھے ستاتی تھی۔ جلاتی تھی۔ کھپاتی تھی۔ مجھ سے نوکروں اور غلاموں کی طرح کام لیتی تھی مجھے بھوکا رکھتی تھی۔ اور میری جان لینے کی فکر میں تھی۔ بھلا میں اس گھر میں رہتا تو کیا رہتا؟ میں نے ہر چند چاہا۔ کہ یہ سالن مجھے نہ ملے۔ اور میں رہ جاؤں۔ مگر گل جان باز نہ آئی۔ اور ہر روز مجھے اپنے سامنے بٹھا کر وہ زہر آلودہ سالن کھلاتی تھی۔ اس لئے میرا دل یکبارگی اُچاٹ ہو گیا۔ اور ایک دن میں والد کی دُکان پر گیا۔ جب سے میری والدہ نے انتقال کیا تھا میں والد کی دُکان پر کبھی نہیں گیا تھا۔ گھر میں نوکروں کی طرح رہتا تھا۔ آج مجھے والد نے دیکھ کر پوچھا کہ ابے تو کہاں؟

میں۔ ابا جان اگر خفا نہ ہو تو کچھ کہوں؟

والد۔ کہو کیا کہتا ہے؟

میں۔ تم خفا ہو گے ٭

والد۔ بات کیا ہے؟

میں۔ تم مارو گے؟
والد۔ نہیں مارتے ٭
میں۔ مجھے ایک دوّنی چاہئے ٭
والد۔ دوّنی کیا کرے گا؟
میں۔ ضرورت ہے ٭
والد۔ وہ کون سی ضرورت تجھے ہے؟
میں۔ ضرورت ہے ٭
والد۔ تُو اب بڑا چٹورا ہو گیا ہے ٭
میں۔ دیکھا۔ میں کہتا نہ تھا۔ کہ تم خفا ہو جاؤ گے ٭
والد۔ لڑکے پیسے نہیں خرچا کرتے ٭
میں۔ اچھا ایک آنہ ہی دے دو ٭
والد۔ جوتیاں پڑیں گی۔ اِدھر آ۔ مجھے پنکھا جھل۔ دوپہر کا وقت ہے۔ اس وقت دھوپ میں نہ پھر ٭
میں۔ ایک آنہ بھی نہیں؟
والد۔ خبردار جو پیسے مانگے ٭
میں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اچھا آبا نہ دو ٭

خدا جانے اُس وقت ابا جان کے دل میں کیا بات آگئی۔ اُنہوں نے مجھے ایک آنے کے پیسے دے دیئے۔ اور کہا۔ کہ پھر

کبھی نہ مانگنا۔ میں نے کہا۔ کہ نہیں۔ ابا اب کبھی نہیں مانگوں گا
میں۔ ابا ایک اور بات ہے*

والد۔ وہ کیا ہے؟

میں۔ مجھے ذرا گلے لگا لو*

والد۔ یہ لڑکا دیوانہ ہوگیا ہے۔ آج کیسی باتیں کرتا ہے؟

یہ کہہ کر میں نے انتظار نہ کیا۔ میرے دل میں جوش اور آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ میں اپنے باپ کے اسی باپ کے جس کا خُون سفید ہوگیا تھا۔ گلے لپٹ گیا۔ اور رونے لگا+ پانچ منٹ تک میری یہی حالت رہی اور میں نے حسرت بھری نگاہوں سے اُس کے چہرے کی طرف نگاہ کی۔ جس کو میں اس وقت آخری مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ جس کا پھر کبھی دیکھنا میری قسمت میں نہ تھا۔ اور یہ کہہ کر کہ ابا جان میں گھر جاتا ہوں۔ دُکان سے چلا آیا*



باب پنجم

ایک دن ہچکی بھی غربت میں نہ آئی افسوس
مجھ کو بھولے ہوئے یارانِ وطن بیٹھے ہیں

جس وقت میں وطن سے نکلا۔ جس وقت میں نے حسرت بھری نگاہ سے اُن گلی کوچوں کی طرف دیکھا۔ جہاں میں نے بادشاہت کا زمانہ صرف کیا تھا + جب میں غربت نصیب ہوا۔ اور میں نے اُس شہر کو چھوڑا۔ جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ اور جہاں میری پیاری والدہ دفن تھی۔ تو میری جیب میں صرف چار پیسے تھے۔ اس وقت بے کسی میری ہم دوش۔ یاس ہم عنان تھی۔ اور ؎

شکستِ اپس وپیش منڈلا رہی تھی
میں قدم آگے رکھتا تھا۔ اور وہ پیچھے پڑتا تھا +

جس وقت میں لاہور سے نکلا۔ تو میرے سر پر ایک معمولی عرق چین کی ٹوپی تھی۔ مگر اب اُس کا رنگ بدرنگ ہوگیا تھا۔ کیونکہ میں اُس کو ایک سال سے زیادہ عرصے سے پہنے ہوئے تھا + یہ میری غریق رحمت والدہ کی نشانی تھی۔ جب وہ زندہ تھی۔ تو اُس نے یہ اپنے ہاتھ

[illegible]

میرا کُرتہ ململ کا اور صدری لٹھے کی تھی اور پاجامہ بھی لٹھے کا تھا میرے پاؤں میں بادامی رنگ کی ایک پُرانی گرگابی تھی۔ اس بے سرو سامانی کے ساتھ میں پاپیادہ گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا ٭

جس وقت میں گھر سے چلا تھا۔ تو ابھی میں نے صبح کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس لئے جب میں نے چھ سات کوس کا سفر کیا۔ تو میری بھوک چمکی۔ اور شدّت کی پیاس مجھے معلوم ہوئی۔ لیکن اس بے آب و دانہ صحرا میں سوا ے درختوں کے پتّوں کے اَور کیا تھا۔ جس سے آتش معدہ بجھاتا ؟ اس وقت میرا یہ عالم تھا۔ کہ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ تکان اور کسل سے پاؤں من من کے معلوم ہوتے تھے + قریب تھا۔ کہ بے ہوش ہو کر جنگل میں گر پڑوں۔ کہ دُور سے مجھے درختوں کے جُھنڈ میں ایک جھونپڑی نظر آئی + اس جھونپڑی کو دیکھ کر مجھے ڈھارس بندھی۔ اور میں اُفتاں و خیزاں وہاں تک پہنچا ٭

اس جھونپڑی میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ اور کچھ کھا رہے تھے۔ اور پاس ایک کُتّا لیٹا ہوا اُن کے مُنہ کو غور سے دیکھ رہا تھا + مجھے دیکھ کر وہ کُتّا چونکّا ہوا۔ اور غرّانے لگا۔ اور پھر مجھ پر حملہ آور ہوا + کُتّے کو دیکھ کر میری رہی سہی قوت جاتی رہی۔ اور میں زمین پر گر پڑا + مجھے

گرتا ہوا دیکھ کر دونوں بجائے اس کے کہ اُن کو رحم آتا۔ کھِل کھلا کر ہنس پڑے۔ پھر ایک نے سیٹی بجائی۔ اور وہ کُتّا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اور میرے دم میں دم آیا۔ پھر وہ دونوں میری طرف مخاطب ہوئے۔ اور مجھ سے اس طرح ہم کلام ہوئے:۔

ا۔ تو کون ہے ؟

۲۔ یہاں کیوں آیا ہے ؟

میں۔ میں بھوکا ہوں۔ اور بات کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ پہلے مجھے کھانے کو کچھ دو۔ کہ مجھ میں طاقت آئے۔ اور میں اپنی سرگزشت تم کو سناؤں ؛

ا۔ کیا یہ تنور ہے ؟

۲۔ کیا یہ بھٹیارے کی دُکان ہے ؟

میں۔ آپ مجھ پر رحم کریں۔ میں بے کس آوارۂ وطن ہوں ؛

ا۔ رحم کس جانور کا نام ہے ؟

۲۔ رحم کس جنگل میں رہتا ہے ؟

میں۔ اے خدا کے بندو کچھ دل میں انصاف کرو ؛

ا۔ انصاف تو یہ کہتا ہے۔ کہ جو روٹی ہم نے محنت اور مشقت سے کمائی ہے۔ وہ تجھ کو مفت نہ دیں ؛

۲۔ تو فقیر ہے۔ تو شہر میں جا کر سوال کر۔ جہاں تجھ کو خیرات ملے ؛

میں۔ آپ صاحبان کون ہیں ؟

۱۔ سچ سچ بتائیں۔ کہ جھوٹ بتائیں ؟

۲۔ ہم قزاق ہیں۔ قزاق ٭

۱۔ ہم ڈاکو ہیں ٭

یہ سن کر میں خوف سے کانپنے لگا ٭

میں۔ خدارا میری جان بخشی کرو۔ اور مجھے رستہ بتادو۔ تاکہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میں مفلس ہوں۔ غریب ہوں۔ بے نوا ہوں ٭

۱۔ یہ تو ہم کو معلوم ہے۔ تیرے کہنے کی ضرورت نہ تھی ٭

۲۔ اگر مفلس نہ ہوتا۔ تو اس وقت تک ہم تجھے قتل کر چکتے۔ یہ دیکھ چمکتا خنجر۔ اس نے خدا جانے کتنے مسافروں کا خون چکھا ہے ٭

یہ کہا۔ اور دوسرے ڈاکو نے مجھے ایک تیز پیش قبض دکھایا۔ جس کی آب دیکھ کر میری آنکھ کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ اور موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ میں نے جھٹ جیب سے ایک آنے کے پیسے جو میری تمام کائنات تھی۔ نکال کر اس جگہ ان قزاقوں کے سامنے رکھ دیئے۔ اور کہا۔ کہ خدا کے واسطے مجھے ایک ٹکڑا روٹی کا اور تھوڑا سا پانی دو۔ کہ مجھ میں توانائی آئے۔ اور اس قابل ہو جاؤں۔ کہ سفر کر سکوں ٭

۱۔ ہاں یہ بات منظور ہے ٭

۲- البتہ یہ انصاف کی بات ہے ؛

۱- چونکہ یہ جنگل ہے۔ یہاں چیز مہنگی ملتی ہے ؛

۲- یہ بھٹیارے کی دُکان نہیں ہے۔ کہ چار روٹیاں مِل جائیں ؛

میں۔ مجھے تو ایک ٹکڑا روٹی کا چاہئے۔ اور ایک گھونٹ پانی کا ؛

یہ سُن کر اُن میں سے ایک نے مجھے ایک سوکھی روٹی دی۔ یہ روٹی مجھے اس وقت شیرمال سے بڑھ کر لذیذ معلوم ہوئی + میں نے وہ روٹی کھائی اور مٹی کے پیالے میں پانی پیا + جس وقت اُن چوروں کی صورت دیکھتا تھا۔ کانپ جاتا تھا + اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ پرلے درجہ کے ظالم۔ ستم پیشہ۔ بے درد اور سفّاک ہیں۔ اُن کے نزدیک انسان چیونٹی کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتا + یہ اکّے دُکّے مسافر کو لوٹ مار کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ اور فقیر بن کر دھوکے کی ٹٹّی کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں۔ جس وقت ایک روٹی اور پانی میرے پیٹ میں گیا۔ تو عجیب قسم کی غنودگی مجھ پر طاری ہوئی۔ ہر چند میں نے چاہا۔ کہ ہُشیار رہوں۔ مگر نہ ہوسکا مجھ کو اس حال میں دیکھ کر دونوں ہنسے۔ اور آپس میں اشارے کرنے لگے ؛

۱- ارے لڑکے تو کیوں ڈرتا ہے ؟

۲- اگرچہ لوٹ مار ہمارا کام ہے۔ مگر ہم بلا ضرورت یہ کام نہیں

کرتے۔ ہمیں تیری جان لینے سے کیا مطلب۔ اگر تیرے پاس
روپیہ ہوتا۔ تو ہم بلاشک تجھے مار ڈالتے۔ اور تیرا روپیہ چھین لیتے
مگر چونکہ تو مفلس۔ کنگال ہے۔ تیرا بال تک بینکا نہ ہوگا۔ تو تھکا ہوا
ہے۔ تھوڑی دیر سو جا۔ جب جاگے گا۔ تو یہ سب تکان دور ہو
جائے گی۔ اُس وقت تو بے شک اس قابل ہوگا۔ کہ سفر کر سکے۔
اگرچہ مجھے ان دونوں کی صورت سے ڈر لگتا تھا۔ اور مجھے اُن کی
شکل میں موت کی صورت نظر آتی تھی۔ مگر میں نے اپنے پاؤں میں
اس قدر ہمت نہ پائی۔ کہ سفر کر سکوں۔ اور چار و ناچار اُن کی جھونپڑی
میں ایک طرف لیٹ گیا۔ اور سو گیا۔

نیند بُری بلا ہے۔ جب یہ نہیں آتی۔ تو مخمل کی سیج اور ریشمی
گدیلوں پر نہیں آتی۔ اور جب آتی ہے۔ تو سولی کی نوک پر آجاتی
ہے۔ مجھ پر اُس وقت نیند نے اس قدر غلبہ کیا کہ میں غافل ہو کر
سو گیا۔ خدا جانے میں کس قدر عرصے تک سوتا رہا۔ جب میں
جاگا۔ تو نہ وہ جھونپڑی تھی۔ نہ وہ قزاق تھے۔ میں تن تنہا ایک
کھجور کے درخت کے نیچے پڑا تھا۔ مگر تمام بدن سے برہنہ تھا۔
صرف ایک لنگوٹی گاڑھے کی میری کمر کے گرد بندھی ہوئی تھی۔
پہلے تو میں نے یہ سمجھا۔ کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں اور آنکھیں
ملتا اُٹھ بیٹھا۔ مگر پھر مجھے معلوم ہوا۔ کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اور

حریص اور سنگ دل چوروں نے میرے کپڑے بھی اُتارے۔ اور اُس حالت میں مجھے اُس درخت کے نیچے پھینک گئے + اس بے کسی کی حالت میں مجھے اپنی حالت پر رونا آیا۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر رویا + جب روتے روتے آنکھوں میں آنسو نہ رہے۔ تو تن بہ تقدیر ننگے سر ننگے پیر۔ ننگے بدن لنگوٹی باندھے جس طرف دل نے گواہی دی روانہ ہوا۔ جب چلتے چلتے تھک جاتا تھا۔ تو درختوں کے نیچے بیٹھ کر دم لیتا تھا۔ اور پھر ذرا تازہ دم ہو کر چلنے لگتا تھا +

آخر ہزار مصیبت سے میں ایک بستی میں پہنچا۔ اور فقیروں اور کنگالوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرنے لگا + اُس وقت بھوک سے میری انتڑیاں کٹی جاتی تھیں۔ ضعف سے میری بصارت میں فرق آ گیا تھا۔ میرے قدم ڈگمگائے جاتے تھے۔ اور زمین و آسمان تیرہ و تار نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا۔ کہ اس گاؤں کے لوگ اچھے اچھے کپڑے پہن کر کسی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے ایک آدمی سے حوصلہ کر کے پوچھا۔ کہ یہ لوگ کس طرف جاتے ہیں۔ تو اُس نے کہا۔ کہ آج اِس گاؤں کے نمبردار کے ہاں نیاز ہے + نمبردار نے کوئی منّت مانی تھی۔ وہ خدا نے پوری کی ہے۔ اس لئے اُس نے یہ نیاز دی ہے۔ نمبردار کے ہاں

پُلاؤ زردہ قورما اور طرح طرح کے کھانے پک رہے ہیں۔ ہم کو بھی بلاوا آیا ہے۔ اور وہیں جاتے ہیں ؂

ہائے بُھوک! تیرا مُنہ کالا ہو! جس وقت میں نے نمبردار کے ایسے لذیذ کھانوں کا ذکر سُنا۔ تو بھوک کے مارے میں نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھا۔ اور میں بھی نمبردار کے مکان کی طرف اس طرح بھاگا جیسے بدکردار اہل کار سایلوں کے پیچھے رشوت لینے کے لئے بھاگتے ہیں۔ جب میں نمبردار کے مکان پر پہنچا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ واقعی نمبردار کے مکان پر طرح طرح کے کھانے پک رہے ہیں۔ اور ذیلدار۔ نمبردار۔ پٹی دار۔ چودھری وغیرہ بیٹھے حقے پی رہے ہیں۔ میں نے چاہا۔ کہ میں بھی وہاں جا کر اُن کے درمیان بیٹھ جاؤں۔ مگر میری صورت دیکھ کر لوگوں کو نفرت آتی تھی۔ اور لاحول پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ نہ میرے سر پر ٹوپی تھی۔ نہ پاؤں میں جوتی تھی۔ میں بالکل برہنہ تھا۔ صرف ایک لنگوٹی بندھی ہوئی تھی ؂

جس وقت میں نمبردار کے مہمانوں کے درمیان جا کر بیٹھنے لگا۔ تو سب میری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے میں کوئی سگِ خارشتی[1] تھا۔ یا مجھے کوئی ایسا چھوت دار مرض تھا۔ جس سے اُن سب

[1] کھجلی والا کُتّا ؂

کو اپنی جان کا اندیشہ تھا۔ میں اس گمان میں تھا۔ کہ یہ نیاز ہے۔ اور نذر غربا اور مساکین کلئے ہوتا ہے۔ مجھے یہ خبر نہ تھی۔ کہ لوگ نذر نیاز بھی دکھاوے کے لئے کرتے ہیں۔ اور مسکین۔ غریب اور محتاج لوگوں کی بجائے اپنے دوستوں۔ رئیسوں اور امیروں کو کھلاتے ہیں۔ بہر حال میں نے اسی امید پر کہ مجھے بے کس یتیم سمجھ کر اچھی طرح کھانا کھلائیں گے۔ اِس مجلس میں قدم رکھا تھا۔ مجھے یہ خبر نہ تھی۔ کہ مجھ سے وہ لوگ اس طرح نفرت کریں گے۔ جیسے جذامی[1] سے کی جاتی ہے۔ جس وقت میں اُس محفل میں گیا۔ تو نمبردار کو سخت غصہ آیا۔

نمبردار۔ او کنگلے کہاں گھسا جاتا ہے؟

ذیلدار۔ اِس نامعقول کو دھکا دے کر باہر نکالو۔

نمبردار۔ یہ کون بدتمیز فقیر ہے؟

پتی دار۔ ابے گھاس کھا گیا ہے۔ جو بھلے مانسوں میں گھسا آتا ہے؟

نمبردار۔ کوئی ہے؟ مارو اس کے دو ہنتھڑ!

چودھری۔ نہیں۔ نہیں۔ مارو نہیں نکال دو۔

میں۔ صاحبو میں یتیم ہوں۔ اور نام خدا کھانے کو آیا ہوں۔

[1] کوڑھی۔

نمبردار۔ تو فقیر ہو کے امیروں کے برابر بیٹھتا ہے؟ وہاں جا کے ایک کونے میں بیٹھ۔ جب سب کھا چکیں گے۔ تو تجھ کو بھی ملے گا۔

میں۔ اچھی نیاز ہے۔ کہ غریبوں کو جواب مل رہا ہے۔

ناظرین میں نہایت شرمگین لڑکا تھا۔ مگر اس وقت بھوک اور فاقے کی تکلیف سے مجبور تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ کہ اُس وقت میرے مُنہ سے کیا کیا الفاظ نکل رہے ہیں "اچھی نیاز ہے" تو نمبردار آگ ہو گیا۔ اور اُس نے ایک جاٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے مجھے کان سے پکڑ لیا۔ اور گھسیٹتا ہوا مجھے دور لے گیا۔ اور میری لنگوٹی کھول کر اُس لنگوٹی سے مجھے ایک درخت کے ساتھ کس کر باندھا۔ اور چلا آیا۔ میں نے ہر چند واسطے دیئے منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے مگر اُس کا دل نرم نہ ہُوا۔

میں۔ خدا کے واسطے میرے حال پر رحم کرو۔

جاٹ۔ تو کنگال ہو کر نمبردار کی برابری کرتا ہے؟

میں۔ میری توبہ ہے۔

جاٹ۔ اپنی طرف تو دیکھ۔ تو کیا چیز ہے؟

میں۔ میرا قصور معاف کرو۔

جاٹ۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

میں۔ میں بے کس ہوں۔

جاٹ ۔ کھا سر اپنا ٭

میں ۔ میری اماں مری ہوئی ہے ٭

جاٹ ۔ ہماری بلا سے ٭

میں ۔ میں اب کبھی نیاز کھانے کسی کے ہاں نہیں جاؤں گا ٭

جاٹ ۔ بکے جا ٭

میں ۔ خدا کا خوف کرو۔ مجھے نہ ستاؤ ٭

جاٹ ۔ (تھپیڑ مار کر) یہ دیکھا خدا کا خوف ؟

میں ۔ (رو کر) میری اماں تو کہاں ہے ؟ مجھے بھی اپنے پاس بلا لے ٭

جاٹ ۔ (ہنس کر) ہاں اپنی میا کو بلا ۔ وہ تو تجھے پلاؤ کھلائے گی ۔ نہیں میں بھول گیا ۔ دودھ پلائے گی ٭

میں ۔ میری توبہ ہے ۔ جو میں کبھی پلاؤ کا نام بھی لوں ۔ میرا گناہ بخشو ۔ مجھ سے قصور ہوا ٭

جاٹ ۔ (ایک تھپیڑ مار کر) یہ زردہ ہے ۔ یہ کھا ٭

میں ۔ ہائے میں مرا ۔ میرے اللہ ٭

جاٹ ۔ اگر اب کے آواز منہ سے نکالی ۔ گلا گھونٹ ڈالوں گا ۔ مجھے تین خون معاف ہیں ٭

میں ۔ مجھے کب چھوڑو گے ؟

جاٹ ۔ جس وقت سب مہمان کھا کر چلے جاویں گے ٭

یمن ۔ مجھے چھوڑ دو۔ تو میں ابھی اس گاؤں سے چلا جاؤں ۔
جاٹ ۔ میں نمبردار صاحب کا حکم رد نہیں کر سکتا ۔
یمن ۔ اچھا بابا خدا تیرا بھلا کرے ۔

ہر چند میں نے گریہ وزاری کی ۔ مگر اس ظالم کو رحم نہ آیا۔ جو مہمان نمبردار کے ہاں آتے تھے ۔ وہ مجھے درخت کے ساتھ بندھا ہوا دیکھ کر ہنستے تھے ۔ اور نمبردار کو پوچھتے تھے ۔ کہ یہ بندر کتنے کو لیا ہے ۔ تعجب ہے ۔ کہ کسی کو میرے حال زار پر رحم نہ آتا تھا ۔ قصہ مختصر نمبرداروں ۔ پتی داروں ۔ چودھریوں اور مہمانوں نے طرح طرح کے کھانے کھائے ۔ مگر یتیم سردار حسین نے جوتے کھائے ۔ تھپڑ کھائے ۔ اور گالیاں کھائیں ۔ اور وہ بے چارہ اسی طرح درخت سے بندھا رہا ۔

باب ششم

کیا ہی بیزار ہے اس زیست سے جی ہائے ستم
قتل کرتے نہیں وہ اور ستم کرتے ہیں

بڑی دیر تک مجھ سے یہ مسخرا پن کرتے رہے ۔ بوڑھوں نے

قہقہے لگائے۔ جوانوں نے تالیاں بجائیں۔ بچوں نے میری طرف کنکر پھینکے۔ غرض جو کچھ اُس وقت مجھ پر گذری۔ وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اُس وقت اگرچہ مجھے مجال گفتگو نہ تھی۔ لیکن میرا دل زبان حال سے یہ شعر پڑھ رہا تھا:

خدا ہی اُس چپ کی داد دے گا۔ کہ تربتیں روندے ڈالتے ہیں
اجل کے مارے ہوئے کسی سے نہ بولتے ہیں نہ چالتے ہیں

آخر بڑی دیر کے بعد تمام مہمان کھانا کھا کر چلے گئے۔ تو نمبردار کے اشارے سے ایک جاٹ نے مجھے درخت سے کھولا۔ اور ایک رکابی پس خوردہ پلاؤ کی۔ جس میں چچوڑی ہوئی ہڈیاں رکھی تھیں۔ میرے سامنے رکھ دی۔ اُس وقت بھوک سے میری حالت دگرگوں تھی۔ میں نے ان جھوٹے چاولوں کو نہایت لذیذ نعمت اور وہ خوان سمجھا۔ جو حضرت موسیٰؑ کی قوم کو عرش سے اُترا کرتا تھا۔ اور خوب سیر ہو کر کھایا جس وقت میرا پیٹ بھر گیا۔ میں اُسی درخت کے نیچے دراز ہو کر سو گیا۔ جس کے ساتھ میں بندھا ہوا تھا۔

اللہ کی شان میں وہی سردار حسین تھا۔ کہ جب والدہ زندہ تھی۔ تو چھپر کھٹ پر سویا کرتا تھا۔ ریشمی انگرکھے اور مخمل کے کوٹ زیب تن کیا کرتا تھا۔ اور آج اس بے کسی کے عالم میں اکیلا تنہا

بندھی تھی۔ زمین بچھونا تھی۔ اور چند مٹی کے ڈھیلے سر کے نیچے تکیے کا کام دے رہے تھے + آج مجھے مدت کے بعد پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوا تھا۔ اس لئے میں ایسا بے ہوش ہوکر سویا۔ کہ کروٹ تک نہ بدلی۔ اور علی الصباح جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ اور پرندے اپنے اپنے نشیمن سے نکل کر چہکنے لگے۔ تو میں بیدار ہوا + جس وقت میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ نمبردار میرے سرہانے کھڑا ہے۔ اور غور سے میری صورت دیکھ رہا ہے ؛

نمبردار۔ لونڈے تو کون ہے ؟

میں۔ یتیم بے کس اور بے بس ؛

نمبردار۔ تیرا کوئی رشتہ دار ہے ؟

میں۔ میرا کوئی نہیں ؛

نمبردار۔ کیا تو جہان میں اکیلا ہے ؟

میں۔ میرا سوائے ذات خدا کے اور کوئی نہیں ؛

نمبردار۔ تو نوکری کرے گا ؟

میں۔ کیوں نہیں ؟

نمبردار۔ اچھا تو میرے لڑکے کو کھلایا کر۔ میں تجھ کو چار آنے

مہینہ اور دو وقت روٹی دیا کروں گا ۔

میں ۔ بہت اچھا ۔

نمبر دار ۔ آ میرے ساتھ ۔

میں ۔ چلئے ۔

نمبر دار ۔ تیرا نام کیا ہے ؟

میں ۔ سردار حسین ۔

نمبر دار ۔ بھئی واہ ! غریب کی جورو ۔ نام عمدہ خانم ۔

میں ۔ اس میں میرا قصور کچھ نہیں ہے ۔ نام ہمیشہ ماں باپ رکھتے ہیں ۔ اب جو آپ فرمائیں ۔ وہ نام رکھ لوں ۔

نمبر دار ۔ سردارا ٹھیک ہے ۔

میں ۔ بہتر ہے ۔ آیندہ جو پوچھے گا ۔ اُس کو سردارا ہی بتاؤں گا ۔

نمبر دار ۔ اگر اچھی طرح کام کرے گا ۔ تو تجھے کپڑے بھی بنا دیں گے ۔

میں ۔ آپ کی مہربانی ۔

میں نمبر دار کے پیچھے پیچھے ہولیا ۔ وہ مجھے اپنے مکان پر لے گئے ۔ بدقسمتی سے نمبر دار صاحب کی دو بیویاں تھیں ۔ ایک تو ادھیڑ عورت تھی ۔ اور دوسری نوعمر تھی ۔ اور اس نوعمر بیوی کے بچّے کے لئے انہوں نے مجھے نوکر رکھا تھا ۔ وہ شخص جن کی دو بیویاں ہیں ۔ جانتے ہیں ۔ کہ سوتیاڈاہ کیا ہوتا ہے ۔ مجھے دیکھ کر

چھوٹی بیوی تو کھل گئی۔ مگر بڑی بیوی آگ بھبوکا ہو گئی۔ نمبردار صاحب مجھے مکان پر چھوڑ کر آپ کچہری پر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی دونو سوتیں باہم لڑنے لگیں ۔

ادھیڑ۔ ارے لڑکے تیرا کیا نام ہے ؟

میں۔ سردار حسین۔ سردارا ۔

ادھیڑ۔ تو کہاں کا رہنے والا ہے ؟

میں۔ لاہور کا ۔

ادھیڑ۔ یہاں کیسے آیا ہے ؟

میں۔ نمبردار صاحب لائے ہیں ۔

ادھیڑ۔ تو ان کو کہاں سے مل گیا ؟

میں۔ راستے میں ۔

نوعمر۔ آوے نا ؟

ادھیڑ۔ منع کون کرتا ہے۔ سَو دفعہ آوے ۔

نوعمر۔ تو میرے نوکر کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی ۔

ادھیڑ۔ میری بلا کو ۔

نوعمر۔ واہ ری

ادھیڑ۔ ذرا منہ سنبھال کے بیٹھ ۔

نوعمر۔ چل چنچے ہو ۔

ادھیڑ۔ ٹوٹی ہوئی جوتی کی طرح بہت بڑھتی نہ جا ؛
نوعمر۔ تجھ کو اپنے اوپر سے صدقہ کروں۔ بہت میرے منہ نہ لگ ؛
ادھیڑ۔ میرا ایک صبر ؛
نوعمر۔ صبر پڑے تیری جان پر ؛
ادھیڑ۔ مجھے معلوم ہے۔ تجھ کو اس دھکڑے نے بڑا سر چڑھایا ہے ؛
نوعمر۔ تو جل ؛
ادھیڑ۔ میری بلا جلے۔ جوتی پیزار جلے ؛
نوعمر۔ پیزار اپنے سر پر ؛
ادھیڑ۔ میں تو کہہ چکی ہوں۔ میرا ایک صبر ؛
نوعمر۔ مجھے ایک گھڑی مسکہ کی نہیں گر رہتی۔ خدا جانے یہ چڑیل کس دن مرے گی ؛
ادھیڑ۔ جو مجھے کہتی ہے تیری جان جوانی کے آگے آوے! خدا۔ مجھے ان آنکھوں سے تجھے کوڑھ ٹپکتا دکھاوے ؛
نوعمر۔ تیرے جیسی کئی کتیاں بھونکتی مر گئیں۔ ایک دن تو بھی اسی طرح مر جائیگی ؛
ادھیڑ۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ کہ گنج کھجائے ؛
نوعمر۔ منہ نہیں لگاتا خاوند اور لڑتی مجھ سے ہے ؛
ادھیڑ۔ مجھے کیا ضرورت ہے لڑنے کی۔ میں تو تجھے سات شب برات

کا جیا اٹھ بھی نہیں مارتی۔ اللہ کی شان ہے۔ جو تیرے جیسی ناکاری میری چھاتی پر مونگ دلتی ہے ٭

نوعمر۔ جب سے میں نے نوکر رکھا ہے۔ کم بخت کو آگ لگ گئی ہے ٭

ادھیڑ۔ لے جا گھر نوکر کو اٹھا کر ٭

نوعمر۔ چہ خوش۔ میں گھر کی مالک میں کہاں جاؤں۔ نکل تو جس کو خاوند منہ نہیں لگاتا ٭

میں۔ جانے دو۔ نہ لڑو ٭

نوعمر۔ تو نہ بول۔ بیچ میں ٭

میں۔ میں عرض کرتا ہوں۔ کہ وہ بڑی ہیں۔ ان سے برابری نہیں کرنی چاہیئے ٭

نوعمر۔ لو اور سنو۔ مینڈکی کو بھی زکام ہوا ٭

میں۔ قصور معاف۔ میں نے تو دنیا کی بات کہی ہے ٭

نوعمر۔ تو نوکر میرا ہے یا اس کا ؟

میں۔ دونوں کا ٭

نوعمر۔ تو اس کا بھی نوکر ہے ؟

میں۔ اس کا بھی اور آپ کا بھی ٭

نوعمر۔ اگر تو اس کا نوکر ہے۔ تو میں تیرے سر پر خاک ڈالتی ہوں

دفع ہو جا۔ میری آنکھوں کے سامنے سے ۔

میں۔ سرکار آپ بھی میرے مالک۔ اور وہ بھی۔ وہ آپ سے بڑی ہیں۔ ان کی عزت کرنی چاہیئے ۔

نوعمر۔ عزت۔ میں تو اس کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں ۔

میں۔ آپ مالک ہیں ۔

نوعمر۔ بس میں تجھ کو رکھنا نہیں چاہتی۔ تو اِس اماں حوّا کی نوکری کر ۔

ادھیڑ۔ یہ بارہ تالی کرتی کیا ہے ؟

نوعمر۔ او نامراد! تو یہاں سے جاتا کیوں نہیں ۔

میں سمجھ گیا۔ کہ میری کم بختی آ گئی۔ یہ نوعمر بلا کی دریدہ دہن تھی۔ اس کے ہاتھ بھی چلتے تھے۔ اور زبان بھی چلتی تھی۔ میرا اتنا کہنا۔ کہ میں تم دونوں کا نوکر ہوں۔ اس کو سخت ناگوار گزرا ۔ بھبوکا ہو گئی۔ اپنی جگہ سے اُٹھی اور چولہے میں سے جلتی ہوئی لکڑی نکال کر مجھے مارنے دوڑی ۔ ادھیڑ عورت نے مجھے خبردار کر دیا۔ ورنہ وہ ضرور میرا مُنہ جُھلس دیتی ۔ اس تتیّا مرچ کا غصّہ میرے ایک طرف ہو جانے سے اور بھی بھڑکا ۔ وہ دھڑادھڑ چھاتی پیٹنے لگی جب پیٹتے پیٹتے بے دم ہو گئی۔ تو اپنے بچے کو اُٹھا کر کئی تھپیڑ لگائے۔ اور وہ بچّہ جو گلاب کا پھول تھا۔ بلبلا اُٹھا ۔

اِس حرکت سے بھی اس اُچھال چھکّا کی تسلّی نہ ہوئی۔ اور اپنی

سوت کے گلے کا ہار ہو گئی + وہ بے چاری ڈھل چکی تھی۔ اور اُس کے پاؤں میں جوانی کا جوش بھرا ہوا تھا۔ کچھ عرصے تک دونوں اس طرح گتھم گتھا رہیں۔ جیسے دو پہلوان اکھاڑے میں ورزش کرتے ہیں + آخر یہ نوعمر غالب آ گئی۔ اور اس بے چاری ادھیڑ عورت کو گرا کر اُس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ اور اُس کے بال نوچ لئے + میں ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا۔ مگر اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کروں + دوپہر تک ان دونوں کی لڑائی جاری رہی۔ میں حیران ہوں۔ کہ اس عورت کا گلا کس بلا کا تھا۔ کہ تھکنے میں نہ آتا تھا + جب دوپہر ہوئی تو نمبردار صاحب کھانا کھانے گھر آئے + آ کے آ کر اُنہوں نے دیکھا۔ کہ توا الٹا پڑا ہے۔ اور دیگچی میں خاک بھری ہے +

نمبردار۔ ایں! یہ کیا معاملہ ہے؟

ادھیڑ۔ پوچھو اپنی لاڈو سے +

نوعمر۔ یہ دیکھو ننھے کا کیا حال ہے؟

ادھیڑ۔ ہیں یہ بچہ نیلا کانچ ہو رہا ہے۔ اس کو کس نے مارا؟

نوعمر۔ جو نیا نوکر تم نے رکھا ہے۔ اس نے +

ادھیڑ۔ میں حیران ہوں۔ یہ آسمان کیسے قائم ہے؟

نوعمر۔ اس آماجوا کی شہ سے اُس نے ایسا کیا ہے +

نمبردار۔ کیوں رے بدذات!

پیس۔ جناب میری یہ مجال کہاں تھی۔ کہ آپ کے صاحب زادے کی طرف تیکھی نگاہ سے بھی دیکھوں۔ مارنا تو درکنار ہے۔

نمبردار۔ معلوم ہوگیا۔ کہ تم دونوں بڑے شریر ہو۔

ادھیڑ۔ خدا سے ڈر۔ خدا کا خوف کر۔ مرنا بھی یاد ہے۔ کہ نہیں؟

نمبردار۔ نہیں تو عاقبت کا توشہ بٹورے گی۔

ادھیڑ۔ یہ لڑکا بالکل بے گناہ ہے۔

نمبردار۔ جیسی تو پاک صاف ہے۔

نوعمر۔ اسی بات کے لئے مجھ سے نکاح کیا تھا۔ مجھ سے روز کے یہ بکھیڑے نہیں دیکھے جاتے۔ یہ دیکھو اُس نے میرا کرتا دھجیاں کردیا ہے۔

اس نمبردار کی پہلی بیوی سے اولاد نہ ہوتی تھی۔ اس لئے اُس نے دوسری کی تھی۔ اس سے خدا نے اُس کو بیٹا دیا۔ اب پہلی بیوی بے چاری جو نہایت شریف تھی۔ زائد المیعاد تصور ہوکر داخل دفتر ہو گئی تھی۔ اور یہ نئی بیوی گھر کی مختار تھی۔ مگر کوئی دن خالی نہ جاتا تھا۔ کہ ان دونوں سوکنوں کی آپس میں لڑائی نہ ہو۔ نمبردار چونکہ نئی بیوی کا دلدادہ تھا۔ ہمیشہ اُسی کی طرفداری کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر جب اُس نے دیکھا۔ کہ اُس کی چہیتی بیوی کا کُرتا پھٹا ہوا ہے

اور اُس کے نور العین کے بدن پر نیل پڑے ہوئے ہیں۔ تو اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا+ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بڑی بیوی کو چوٹی سے پکڑ کر اتنی جوتیاں ماریں۔ کہ اس غریب ناکردہ گناہ عورت کا کچومر نکل گیا+ پھر اُس کو چھوڑ کر مجھے بالوں سے پکڑ کر اتنا مارا۔ کہ میرے مُنہ اور ناک سے خون بہنے لگا+

اے سیاہ بخت ہندوستان! اگر تو ہمیشہ ذلیل اور خوار رہے تو کچھ تعجب نہیں۔ اگر غیر قومیں تجھے جاہلوں کی بستی کہیں۔ تو ہرگز حیرت کا مقام نہیں۔ اے غلاموں کے ملک! تجھ کو غریب اور بے کس عورت کی بددُعا لگی ہے۔ جب تک تیرے باشندے عورتوں کے حقوق نہیں پہچانیں گے۔ جب تک مولوی سیّد ممتاز علی کی کتاب حقوق نسوان پر عمل نہ کریں گے۔ جب تک عورتوں کو جاہل رکھیں گے۔ جب تک اُن کے شیشۂ دل کو چکنا چور کرتے جائیں گے۔ جب تک اُن کو مٹی کا کھلونا سمجھیں گے۔ تب تک سرسبز نہیں ہوں گے+ اے ہندوستان کے رہنے والو۔ عبرت کی آنکھیں کھولو۔ دیکھو وہ قومیں جو آج کل شہرت کے تخت پر جلوس فرما ہیں۔ وہ قومیں جنہوں نے تاج اقبال زیب سر کیا ہے۔ وہ قومیں جنہوں نے قبائے شائستگی در بر کی ہے۔ عورتوں کی کس قدر قدر و منزلت اور عزّت کرتی ہیں+

میں حیران ہوں۔ کہ تم کو کم زور عورتوں کے دل دکھانے میں کیا مزا آتا ہے۔ وہ بے چاریاں تمہارے ستم دیکھتی ہیں۔ اور تم کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھتی ہیں ؎

اُن کے نزدیک مرے دل کی حقیقت کیا تھی۔
ایک مٹی کا کھلونا تھا۔ گرا ٹوٹ گیا۔

تم جانتے ہو۔ کہ قدرت نے ہر ایک چیز کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ اور باوصف اس علم کے تم ایک عورت پر اکتفا نہیں کرتے اور دو دو تین تین عورتیں گھر میں ڈال کر ان کی چھاتی پر مونگ دلتے ہو۔ مونگ دلنا تو بالائے طاق اُن کو مارتے ہو۔ اُن پر جبر و تعدی روا رکھتے ہو۔ اور اُن کو اس طرح سمجھتے ہو۔ جیسے گھر کی گائے بھینس ؛

اس بے رحم نمبردار نے اپنی پہلی بیوی کو نہایت سنگ دلی سے مارا۔ اور مجھے ادھ موا ہی کر دیا ؛

نمبردار۔ کن ہاتھوں سے میرے لال کے تھپڑ مارے تھے ؛

نوعمر۔ اس کو دفع کرو ؛

نمبردار۔ نہیں میں اس کو سیدھا تیر بنا کر یہاں سے دفع کروں گا ؛

نوعمر۔ میں اس کو رکھنا نہیں چاہتی ؛

نمبردار۔ یہ ہمارا غلام ہے۔ اس کو دفع کہاں کریں ؛

نوعمر۔ بیچ ڈالو ٭

نمبردار۔ ہاں یہ بات ٹھیک ہے ٭

نوعمر۔ بہرحال میں اس کو اپنے گھر میں رہنے نہیں دوں گی ٭

نمبردار۔ جو صلاح تم نے دی ہے۔ بہت اچھی ہے ٭

نوعمر۔ کہاں بیچو گے؟

نمبردار۔ خان صاحب کے پاس ٭

نوعمر۔ اچھا اسے ابھی لے جاؤ ٭

نمبردار۔ ہاں ابھی لے جاتا ہوں۔ اتفاق سے خان صاحب شکار کھیلنے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ابھی جا کر اس کے نقدے کھرے کرتا ہوں ٭

ادھیڑ۔ اِس یتیم کا صبر تم دونوں پر پڑے گا۔ میری تو خیر ہے۔ میں تو زندگی کے دن جس طرح ہوگا۔ پورے کر لوں گی ٭

نمبردار۔ تو دفع کیوں نہیں ہوتی۔ ہمارے گھر سے۔ تجھ کو رکھا کس نے ہے؟

ادھیڑ۔ اللہ مجھ کو تمہارے پنجے سے رہائی دے ٭

نمبردار۔ اُٹھو پھر؟

ادھیڑ۔ میں تو موذی کے چنگل میں گرفتار ہوں ٭

نمبردار۔ تو طلاق کیوں نہیں لے لیتی؟

ادھیڑ۔ کوئی دے بھی ؎

نمبردار۔ اچھا ٹھیر جا۔ آج تیرا بھی فیصلہ کرتا ہوں ؎

ادھیڑ۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔ میرا حق مہر میرے حوالے کر ؎

نمبردار۔ دیکھ تو سہی۔ تجھے کیا کچھ دیتا ہوں ؎

ادھیڑ۔ اگر خدا ہے۔ تو جتنا ظلم تم نے اس یتیم پر کیا ہے۔ اُس کا تم کو ضرور بدلہ ملے گا ؎

خدا جانے اس ادھیڑ کے دل میں کیا بات آئی۔ کہ وہ اپنے درد اور دُکھ کو بھول گئی۔ اور اُٹھ کر اُس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور چیخیں مار کر رونے لگی + میں تو آگے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اتنا رویا اتنا رویا کہ گھگی بندھ گئی + ہم دونوں کے نالۂ و بکا نے نمبردار اور اُس کی منظورِ نظر بیوی کو حیران کر دیا۔ اور کچھ عرصے کے لئے دونوں کے مُنہ پر مُہرِ خاموشی لگا دی ؎

ادھیڑ۔ میرے لال کہاں کہاں تیرے چوٹ لگی ہے؟

میں۔ سر میں اور پیٹھ پر ؎

ادھیڑ۔ صبر کر۔ اللہ تجھے اِن آدم خور لوگوں کے ہاتھ سے نجات دے ؎

میں۔ "جو آج میری اماں زندہ ہوتی......"

نمبردار۔ بس مت بک ؎

ادھیڑ۔ یہ تمام آفت تجھ پر مجھ نصیبوں جلی کے باعث پڑی ہے ۔
نمبردار۔ اولڑکے گھڑے سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھو۔ اُٹھ دیر نہ کر ۔
ادھیڑ۔ جالال تجھے خدا کے حوالے کیا ۔
میرے دل پر اس نمبردار کا سایہ کچھ ایسا غالب ہؤا۔ کہ یہ مجھے ملک الموت نظر آنے لگا۔ باوجودے کہ میرا بند بند درد کرتا تھا۔ میں نے فوراً اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ اور حکم کا منتظر ہو بیٹھا۔ پھر نمبردار نے مجھے سفید ململ کا کُرتا پہنایا۔ سُرخ صافہ بندھوایا۔ ایک لنگی مجھے باندھنے کو دی۔ اور کہا۔ کہ میرے ساتھ چلا آ۔ میں چُپکے چُپکے ساتھ ہولیا۔ مگر میرا کلیجہ دھڑکتا تھا۔ اور سوچتا تھا۔ کہ دیکھئے کون سی تازہ مصیبت میرے سر پر نازل ہونے والی ہے ۔
نمبردار مجھے گاؤں سے باہر ایک میل کے فاصلے پر لے گیا۔ جہاں ایک خیمہ نصب تھا۔ اور خیمے کے باہر دو چار آدمی تازی کُتّے باز اور بندوقیں لئے کھڑے تھے۔ نمبردار نے ایک ملازم سے دریافت کیا۔ کہ خان صاحب کہاں ہیں۔ اور اندر اطلاع کرائی۔ اور مجھے ہمراہ لے کر خیمے میں داخل ہؤا۔ خیمہ اندر سے دلھن کی طرح آراستہ تھا۔ اور ایرانی قالین پر ایک شخص جس کی صورت سے امیری برستی تھی۔ رُعب داب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس شخص کی عمر قریب پچاس سال کے تھی۔ ڈاڑھی میں سفید بال آگئے تھے۔ مگر

چہرے پر نور برستا تھا۔ اور قد و قامت اور چوڑی چھاتی سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ نہایت طاقتور انسان ہے + اس شخص کا نام جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا عبداللہ خاں تھا + نمبردار مجھے ہمراہ لے کر خیمہ میں گیا۔ اور عبداللہ خاں کو جھک کر سلام کیا ؛

نمبردار۔ آداب عرض ہے۔ خاں صاحب ؛

عبداللہ خاں۔ سلام بھئی۔ یہ لڑکا کون ہے ؟

نمبردار۔ حضور کو یاد ہوگا۔ کہ جب آپ پرسال شکار کھیلنے آئے تھے۔ تو حضور نے فرمایا تھا۔ کہ ہم کو ایک ایسا لاوارث لڑکا چاہئے۔ جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ ہو۔ اور خوب صورت خوش رنگ ہو ؛

عبداللہ خاں۔ ہاں ہاں یاد ہے ؛

نمبردار۔ یہ لڑکا حاضر ہے ؛

عبداللہ خاں۔ ہاں ہم کو یہ لڑکا پسند ہے ؛

نمبردار۔ مگر ایک بات ہے ؛

عبداللہ خاں۔ کہو وہ کیا بات ہے ؟

نمبردار۔ حضور بُرا نہ مانیں ؛

عبداللہ خاں۔ بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے ؛

نمبردار۔ ایک شخص نے اس کو پالا ہے۔ اس کو کچھ دینا چاہئے ؛

عبداللہ خاں۔ بہت مناسب ہے۔ تم بتاؤ کیا دیں ؟

نمبردار۔ جو حضور کی مرضی ؟

عبداللہ خاں۔ تمہاری رائے میں کیا دینا چاہئے ؟

نمبردار۔ بیس روپے کافی ہوں گے ؟

عبداللہ خاں۔ کُل بیس روپے ؟

نمبردار۔ آپ مالک ہیں۔ اگر کچھ زیادہ عطا فرمائیں۔ تو عین احسان ہے ؟

عبداللہ خاں نے ایک خدمت گار کے کان میں کچھ کہا۔ اور اُس نے ایک صندوق کھول کر ایک پشاوری لنگی جو کم سے کم .... بیس روپے کی ہوگی۔ اور پچاس روپے نقد دیئے۔ نمبردار کی باچھیں کھل گئیں۔ اور دونوں ہاتھوں سے سلام کرکے وہاں سے رخصت ہُوا۔ اور میں تنہا اُس نیک مرد کے پاس اُس خیمے میں رہ گیا۔ عبداللہ خاں نے میرے حال پر نہایت مہربانی فرمائی۔ اپنے ساتھ دسترخوان پر مجھے کھانا کھلایا۔ اور میرے ساتھ اس طرح پیش آیا۔ جیسے باپ بیٹوں سے برتاؤ کرتے ہیں ؟

اس وقت مجھ پر ہر طرف سے مصیبتوں اور آفتوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ جدھر میں جاتا تھا۔ مجھے دھکّے ملتے تھے۔ جس طرف کا میں رُخ کرتا۔ میری بدقسمتی مجھے تکلیف دیتی تھی۔ یہ پہلا موقع

تھا۔ کہ ایک خدا ترس بندے نے اصلی پیار سے میری مزاج پرسی کی۔ اور مجھے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا۔

دوسرے دن عبداللہ خاں نے حکم دیا۔ کہ اب ہم شکار نہیں کھیلیں گے۔ اور امرتسر میں دو دن قیام کر کے لدھیانہ واپس جائیں گے۔ اسی وقت سفر کی تیاری ہوئی۔ ایک گھوڑے پر خاں صاحب سوار ہوئے۔ اور ایک پر مجھے سوار ہونے کا حکم دیا۔ اور باقی ملازم خچروں پر سوار ہوئے۔ اور خیمہ اور دیگر سامان دو اونٹوں پر جو ساتھ تھے لادا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں اپنی تمام عمر میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ منزل بہ منزل ہم امرتسر پہنچے۔ امرتسر میں خاں صاحب نے بزاز کو بلوایا۔ اور میرے لئے نہایت عمدہ اور قیمتی کپڑا کئی قسم کا خریدا۔ اور درزی سے کہا۔ کہ چھ جوڑے فی الحال نہایت خوش نما اور خوش قطع جس طرح کے معزز پٹھانوں کے لڑکے پہنتے ہیں۔ سردار حسین کے لئے بہت جلدی سی دو۔

امرتسر سے ہم خیریت کے ساتھ لدھیانہ پہنچے۔ جہاں خاں صاحب کا مکان تھا۔ اللہ کی شان جب میں لاہور سے نکلا تھا۔ تو سڑی ہوئی ٹوپی اور لٹھے کا معمولی لباس میرے بدن پر تھا۔ جب میں اس گاؤں میں پہنچا۔ تو صرف لنگوٹی بندھی ہوئی تھی۔ جب میں خاں صاحب کے پاس بکا۔ تو میرا لباس اس قسم کا تھا۔

جیسا کہ معمولی دہقان پہنتے ہیں۔ اور جب میں لُدھیانہ میں خاں صاحب قبلہ کے ہم رکاب وارد ہوا۔ تو میرے سر پر بنارسی سفید پٹکہ اور قیمتی کُلاہ تھی۔ جس پر زردوزی کا کام تھا۔ نافرمانی پلش کا میرا فراک کوٹ تھا۔ جس پر لیس اور ڈوری لگی تھی۔ تین پی کے لٹھے کا میرا پاجامہ تھا۔ اور پاؤں میں خاص ولایتی چمڑے کا بوٹ تھا۔ خدا کے سب کام نرالے ہیں ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

باب ہفتم

کسی خورشید رُو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
مثالِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

عبداللہ خاں صاحب واقعی عجیب انسان تھے۔ یہ در اصل افغان تھے۔ اور کابل کے رہنے والے تھے۔ مگر اُن کا والد کسی باعث سے والیان کابل سے ناراض ہو کر ہندوستان میں آگیا۔ اور لُدھیانہ

میں مقیم ہوا۔ عبداللہ خاں صاحب نے لدھیانہ میں ایک مغلیہ
خاندان کی بیگم سے شادی کی۔ اس شادی سے اُن کے ایک
لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نام صنوبر تھا۔ جس وقت یہ لڑکی پیدا ہوئی
خاں صاحب کی بیوی قضا الٰہی سے فوت ہوگئی۔ خاں صاحب
کو سخت صدمہ ہُوا۔ اور بیوی کے غم میں دیوانہ ہوگئے۔ مگر صنوبر
سے اُن کو اس قدر اُلفت تھی۔ کہ پھر انہوں نے شادی نہ کی جب
میں عبداللہ خاں صاحب کے گھر میں آیا۔ تو یہ لڑکی بارہ
سال کی تھی ؎

خاں صاحب شکار کے دلدادہ تھے۔ سال بھر میں چھ مہینے
وہ شکار گاہ میں رہتے تھے۔ سینکڑوں روپئے کُتّوں۔ بازوں۔
جُرّوں وغیرہ پر صرف کرتے تھے۔ ان کے پاس کئی کُتّے ایسے
تھے۔ جو اُنہوں نے دو دو سَو روپئے کو خریدے تھے۔ گورنمنٹ
سے اُن کو پانسو روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ اور کچھ جاگیر بھی تھی۔
جس کی ماہواری آمدن ہزار روپے سے کم نہ تھی۔ اگرچہ ڈیڑھ
ہزار روپیہ ماہوار کی آمدن تھی۔ مگر اُن کا خرچ بھی بہت زیادہ
تھا۔ اس لئے جمع کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ جب خاں صاحب سفر کی
تکان سے آسودہ ہوگئے۔ تو انہوں نے مجھے بُلایا۔ اور نہایت
پیار سے مجھے اپنے پاس بٹھایا ؎

خاں صاحب۔ سردار حسین اب تو مجھ کو اپنا باپ سمجھ۔ اور اپنی سرگزشت مو بمو مجھے سُنا دے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ کہ تو دہقان کا بیٹا ہو۔ تیرا خوب صورت چہرہ اور تیری لیاقت اِس قسم کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ تو گردش فلک کا ستایا ہوا ہے۔ مگر دراصل کسی اچھے خاندان کا چراغ ہے۔

میں۔ آپ میرے لئے ابر رحمت ہیں۔ آپ سے میں کسی بات کو چھپا نہیں سکتا۔ مگر ڈرتا ہوں۔ کہ آپ مجھے پھر ظالموں کے حوالے نہ کر دیں۔

خاں صاحب۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ تم اپنا اطمینان رکھو۔

میں۔ میرا باپ زندہ ہے۔

خاں صاحب۔ ہیں۔ باپ زندہ؟

میں۔ جی ہاں میرا باپ زندہ ہے۔ مگر میری والدہ غریق رحمت ہو چکی ہیں۔

خاں صاحب۔ تو تُو گھر سے بھاگ کر آیا ہے؟

میں۔ جی ہاں۔

خاں صاحب۔ افسوس ع خود غلط بود آنچہ من پنداشتم۔

میں۔ میں گھر سے کچھ لے کر نہیں بھاگا۔ سوتیلی والدہ کے ظلم و ستم اور باپ کی بے پروائی سے تنگ آکر نکلا تھا۔

خاں صاحب۔ اچھا تم اپنا سارا قصّہ اوّل سے لے کر آخیر تک

مجھ کو سناؤ ⁂

میں۔ میرا قصہ سن کر آپ رو دیں گے۔ میں نے بہت سے صدمے سہے ہیں ⁂

میں نے خاں صاحب کے رو برو تمام سرگذشت اول سے آخر تک بیان کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ کہ برائے خدا مجھے اب آپ اپنے قدموں میں رکھیں۔ اور پھر اُس سنگ دل عورت گل جان کے پاس نہ بھیجیں ⁂

میری سرگذشت سن کر خاں صاحب جو انتہا کے رقیق القلب تھے۔ رونے لگے۔ دست شفقت میرے سر پر پھیرا۔ اور کہا۔ کہ اب تو اس والد کو بھول جا اور مجھے اپنا باپ سمجھ ⁂

میں۔ آپ کی یہ مہربانی دیکھ کر یہ سمجھتا ہوں۔ کہ شاید میرے بُرے دن گئے۔ اور بھلے دن آئے ⁂

خاں صاحب۔ تو جانتا ہے۔ کہ میں نے تجھ کو کس لئے اپنے پاس رکھا ہے ⁂

میں۔ سوائے اس کے اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ آپ نے مجھ پر رحم کیا ہے ⁂

خاں صاحب۔ نہیں میری ایک لڑکی ہے۔ اُس کا نام صنوبر ہے۔ اُس کی شادی میں تیرے ساتھ کروں گا۔ اور بطور خانہ داماد

اپنے گھر میں رکھوں گا۔ چونکہ اس لڑکی کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے میں اس کا نکاح ایسے شخص سے کرنا چاہتا ہوں۔ جو میرے پاس مثل فرزند کے رہے۔

یہ فقرے خاں صاحب کی زبان سے سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ اور مجھے یقین آگیا۔ کہ بے شک جو مثل مشہور ہے۔ کہ رنج کے بعد راحت ہوتی ہے۔ وہ مثل درست اور راست ہے۔ میں ابھی بچہ تھا۔ شادی کا نام سن کر شرما گیا۔ میں نے سر نیچا کر لیا۔ اور خدا جانے کن الفاظ میں خاں صاحب کی عنایتوں کا شکریہ ادا کیا۔

خاں صاحب۔ کل سے تم اسکول میں داخل ہو جاؤ۔

میں۔ حضور نے یہ میرے دل کی کہی۔ مجھے پڑھنے کا نہایت شوق ہے۔

خاں صاحب۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

میں۔ خدا کرے۔ کہ میں اچھی لیاقت حاصل کر کے حضور کے روبرو سرخرو ہوں۔

خاں صاحب۔ ہماری یہ بھی خوشی ہے۔ کہ تم عربی پڑھو۔

میں۔ میں حاضر ہوں۔

خاں صاحب۔ تمہارے لئے ایک معلم مقرر کیا جائے گا۔ جو تم کو گھر میں تعلیم دیا کرے گا۔ آج سے تین سال کے بعد اگر زندگی

نے وفا کی۔ اور خدا کو منظور ہوا۔ تو تمہارا نکاح صنوبر جان کے ساتھ ہو جائے گا۔ اور تم میرے بعد میری تمام جائداد کے مالک ہو گے ۔ اس عرصے میں تم خوب محنت کرو۔ علم حاصل کرو۔ گھوڑے پر چڑھنا سیکھو۔ اور اپنے آپ کو میری دامادی کے لائق اور قابل بناؤ ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت	کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

میں۔ اب انشاء اللہ تعالےٰ اس عرصے میں میں اپنے تئیں حضور انور کی غلامی کے قابل بناؤں گا ۔

خاں صاحب۔ تم میری آنکھوں کے نور ہو۔ اور میرے دل کے سرور ہو ۔ جب سے میں نے تم کو دیکھا ہے۔ خود بخود میرے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو گئی ہے ۔ اور میں خدا سے دُعا کرتا ہوں۔ کہ خدا میری مراد پُوری کرے ۔ اور میں تم کو اپنے گھر میں آباد دیکھوں ۔

میں اس وقت خاں صاحب کے خاص کمرے میں بیٹھا ہُوا تھا ۔ اس مکان میں آنے کی خاں صاحب کے کسی ملازم کو اجازت نہ تھی۔ صرف خاں صاحب کا ملازم خاص دو وقت صفائی کے لئے آتا تھا ۔ میں اور خاں صاحب اُس وقت دونوں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے ۔ کہ ایک کونے کا پردہ اُٹھا ۔ اور ایک لڑکی جس

کی عمر بارہ سال کے قریب تھی۔ مگر قدو قامت سے تیرہ چودہ سال کی معلوم ہوتی تھی چودھویں رات کے چاند کی طرح اُس کمرے میں آگئی۔ اور کہنے لگی۔ ابا جان ہمیں ایک تھان سبز رنگ کی کمخواب کا منگا دو۔ اس لڑکی نے مجھے نہیں دیکھا۔ خاں صاحب نے اُس کو آگاہ کیا۔ اور کہا۔ کہ ہیں ہیں! اس طرح بے اطلاع نہ آیا جایا کرو۔ اُس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں۔ مگر وہ جھٹ پردے کے پیچھے غائب ہو گئی ٭

حضرات ناظرین! یہ صنوبر جان میرے مربّی کی دختر بلند اختر تھی۔ اُس کا قد نہایت موزوں تھا۔ اس کے تمام اعضا نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اس کے بال سنہری تھے۔ اور گھٹنوں تک لمبے تھے۔ اُس کے رنگ کے آگے کندن ہیچ تھا۔ اُس کی پیشانی ماہ تاباں کی طرح چمکتی تھی۔ اس کے ابرو پیوستہ تھے۔ اور آنکھیں بڑی بڑی سیاہ اور رسیلی تھیں۔ ناک سیدھی سُتواں اور ہونٹ نہایت خوش نما پتلے پتلے۔ صنوبر جان نے ایک اطلس کا ڈھیلا پاجامہ اور کسی ریشمی کپڑے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ دونوں سبز تھے۔ اور سر پر جو دوپٹہ تھا۔ وہ بھی سبز تھا ٭

خاں صاحب۔ برخوردار سردار حسین!

میں۔ جناب عالی!

خاں صاحب۔ یہ لڑکی جس کو تو نے اتفاقیہ دیکھ لیا۔ یہ ہی صنوبر جان ہے۔ اگر خدا نے چاہا۔ تو تین سال کے بعد تیرا اسی سے نکاح ہو گا۔ اب تو جا اور تحصیل علم میں مشغول ہو۔

میں خاں صاحب کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ خاں صاحب کی حویلی میں نیچے کے تین کمرے میرے لئے خانصاحب نے آراستہ کرا دئے تھے۔ ایک کمرے میں میرے کپڑے اور صندوق تھے۔ دوسرے میں میرا پلنگ تھا۔ اور تیسرے میں میری جائے نشست تھی۔ یہ تیسرا کمرہ نہایت تکلف کے ساتھ سجایا گیا تھا۔

جس وقت میں خاں صاحب کے پاس سے اُٹھ کر آیا۔ تو میرے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں نے جو مصیبتیں بھگتی تھیں۔ اُنہیں یاد کر کے یہ اندیشہ ہونے لگا تھا۔ کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ بھی میری قسمت کا نیا دھوکا نہ ہو۔ کبھی سوچتا تھا۔ کہ اے سردار حسین یہ بھی خواب ہی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ میں جاگوں۔ اور پھر اپنے تئیں مصیبت میں پاؤں۔

ناظرین بیاہ بھی زندگی میں سب سے بڑی خوشی ہے۔ اس کا نام ہی شادی ہے۔ شادی کے فرائض اور فکر کو بچپن میں کون خیال میں لاتا ہے؟ نام سے خوش ہو جاتے ہیں۔ میں بھی ایسی اچھی دُلھن کی امید سے بہت خوش ہُوا۔ مگر ساتھ ہی یہ خوف مارے

ڈالتا تھا۔ کہ اگر خدا نخواستہ میں نے قابلیت حاصل نہ کی۔ تو شاید میں یہاں سے بھی نکالا جاؤں۔ میں نے اپنی دُلھن کے تعلیم کا حال بھی سُنا تھا۔ مجھے ہر وقت یہ خیال بھی رہتا تھا۔ کہ میری لیاقت میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔ کہ میری دُلھن مجھے حقیر سمجھنے لگے۔ ان خیالوں نے میری ہمت کو بہت مضبوط کر دیا۔ اور میں رات دن علم کے حاصل کرنے میں محنت کرنے لگا۔

جس طرح جنگلوں میں مسافر کسی دور کی آبادی کی روشنی کو دیکھتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح صنوبر کا خیال ہر دم میری راہبری کرتا تھا۔ کسی یونی ورسٹی کا تمغہ یا انعام اتنا دل نہیں بڑھاتا۔ جتنا صنوبر کا ملنا میرے دل کو ہر لحظہ نئی طاقت دیتا تھا۔ غرض میری زندگی کی راحت۔ میری محنتوں کا پھل میری تمناؤں کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ میں ایسی قابلیت حاصل کر لوں۔ کہ صنوبر سی لایق اور قبول صورت دلھن کے ساتھ میری شادی ہو جائے۔



باب ہشتم

میری بھی کشتِ تمنّا کو ہرا کر دے گا
خاک میں جس نے کہ سرسبز کیا دانے کو

صنوبر کی محبّت میرے سمندِ شوق اور کوشش کے لئے تازیانہ تھی۔ میں خوشی خوشی اسکول میں داخل ہُوا۔ ایک مولوی صاحب مجھے عربی فارسی پڑھانے کے لئے نوکر رکھے گئے۔ خاں صاحب نے دو گھوڑے جن میں ایک سمند سیاہ زانو۔ اور دوسرا کمیت تھا میرے لئے خریدے۔ میرا یہ معمول تھا۔ کہ صبح و شام سواری کی مشق کیا کرتا تھا۔ اور تمام دن کتابوں کا کیڑا بنا رہتا تھا۔ میں خاں صاحب سے وعدہ کرچکا تھا۔ کہ میں تین سال میں اپنے آپ کو لایق کرکے دکھا دوں گا۔ اور اس وعدے کو میں پُورا کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ جو کام شوق کے ساتھ کیا جائے۔ وہ کیسی جلدی اور کس قدر عمدگی سے ہوتا ہے۔ تین سال گزر گئے۔ اور تین سال کے عرصے میں میں نے اس قدر لیاقت حاصل کرلی۔ کہ انگریزی فر فر بول سکتا۔ عربی میں شرح ملّا پڑھتا تھا۔ عربی عبارت کا ترجمہ اُردو میں

اور اُردو کا عربی میں کرسکتا تھا۔ اور فارسی میں سکندر نامہ۔ شاہنامہ قصائد عرفی۔ انوری۔ اور قاآنی۔ بدرچاچ۔ اور درّۂ نادرہ بھی میری نظر سے گزر چکے تھے + اُس زمانے میں جس کا میں ذکر کررہا ہوں جس کو اس قدر لیاقت ہوتی تھی۔ وہ اچھا فارغ التحصیل سمجھا جاتا تھا میری اس محنت اور قابلیت سے خاں صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور مجھ کو پہلے سے بھی دس گنا زیادہ محبت کرنے لگے +

وہ زمانہ جس کو خوشی کے ایام کہتے ہیں۔ بہت جلد گزرجاتا ہے۔ اس قدر جلد گزرجاتا ہے۔ کہ جاتا معلوم نہیں ہوتا۔ اور تکلیف کا ایک دن گزرنا بھی دشوار ہوتا ہے غم کی ایک گھڑی ایک سال کے برابر ہوتی ہے۔ راتوں کو نیند نہیں آتی۔ دن اضطراب اور قلق میں بسر ہوتا ہے۔ اور در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے ہیں + تین سال کا عرصہ بڑا عرصہ ہے + اس میعاد میں اس جہان میں بہت کچھ انقلاب ہوئے۔ بہتیرے نابالغ بالغ ہوگئے۔ کواری لڑکیاں بیاہی گئیں۔ بیاہی لڑکیاں صاحب اولاد ہوگئیں۔ بہتیری صاحب اولاد بیوہ ہوگئیں۔ سینکڑوں بچے یتیم ہوگئے + ان تین سال میں خدا جانے کتنے امیر فقیر ہوگئے۔ کتنے ساہوکاروں کا دیوالہ نکل گیا۔ کتنے سوداگروں کی دُکانیں چمک گئیں۔ اور کتنے بدبختوں کا بازار سرد ہوگیا + کتنے ویرانے آباد ہوگئے۔ اور کتنے بستے گھر اُجڑ گئے۔ کتنی آندھیاں آئیں

زلزلے آئے۔ بارشیں ہوئیں۔اولے پڑے۔ کتنے خدا کے بندے
فرش زمین سے ہم آغوش ہوئے ؂
مختصر یہ کہ ان تین سال میں اس دنیا میں انقلاب عظیم واقع ہوا۔
اور میں بھی جاہل بے علم۔خانہ بدوش سردار اسے مولوی سردار حسین
اور خاں صاحب عبداللہ خاں کا خویش بن گیا + جس دن تین
سال ختم ہوئے۔خاں صاحب نے ساعت سعید دیکھ کر صنوبر
کا نکاح میرے ساتھ کردیا ؂
اس موقع پر جو حوصلے خاں صاحب نے نکالے۔اُن کا بیان
میں آپ سے کیا کروں۔خاں صاحب نہایت فیّاض اور فراخ
حوصلہ آدمی تھے۔ وہ روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتے تھے + میری شادی
پر انہوں نے دل کھول کے روپیہ صرف کیا + کئی دن تک جلسے
اور تماشے ہوتے رہے۔اور روپیہ ٹھیکریوں کی طرح لٹتا رہا + خاں
صاحب نے دوستوں کو دعوتیں دیں۔غربا اور مساکین کو ایک ہفتے
تک ہر روز دو وقت پُرتکلّف کھانا کھلایا۔خیرات کی۔اور رقص و
سرود کی مجلسیں گرم کیں ؂
میرا یہ عالم تھا۔کہ میں نے یہ تین سال گھڑیاں گن گن کر گزارے تھے +
مجھے ہمیشہ یہ خوف لگا رہتا تھا۔کہ کبھی میں خاں صاحب کی نظر میں
نالائق نہ ٹھیروں + میں اس وقت کے لئے آدھی رات کو دعائیں مانگا

کرتا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ کولمبس کو نئی دنیا دریافت کر کے گلیلیو کو دوربین ایجاد کر کے سر آئزک نیوٹن کو مسئلہ کشش ثقل حل کر کے واسکوڈے گاما کو ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کر کے اس قدر خوشی نہیں ہوئی ہوگی۔ جس قدر مجھے صنوبر کے حاصل ہونے سے ہوئی۔ مجھے صنوبر کیا ملی۔ گو گردِ سرخ اور لعل سپید مل گیا۔ جس قدر تلاش مجھے صنوبر کی تھی۔ اس قدر بھوکے کو کھانے۔ پیاسے کو پانی اور بیمار کو صحت کی نہیں ہوتی۔

صنوبر کے ساتھ مجھے بے انتہا محبت والفت ہوگئی۔ ناظرین صنوبر کو آپ شمع اور مجھے پروانہ سمجھ لیں۔ صنوبر کو گل اور مجھے بلبل جان لیں۔ میں اس پر اس قدر شیدا تھا۔ کہ اگر ایک گھنٹہ وہ مجھے نظر نہ آئے۔ تو میں دیوانہ ہو جاتا تھا۔ صنوبر کو خدا نے ہمہ صفت موصوف پیدا کیا تھا۔ وہ سرخ و سپید مٹی کی نری تصویر نہ تھی۔ بلکہ وہ نیکی اور نیک سیرتی کی مجسّم تصویر تھی۔ خاں صاحب نے اُس کو فارسی اور عربی کی تعلیم دلائی تھی۔ اور عقلِ خداداد کی رسائی سے اُس کو اس قدر ملکہ تھا۔ کہ وہ طبیعت موزوں رکھتی تھی۔ اور شعر کہہ سکتی تھی۔ اس کو خدا نے آواز ایسی شیریں اور دل کش دی۔ کہ خواہ مخواہ وہ دل کھینچتی تھی۔ شادی سے پہلے میں انہیں تین کمروں میں رہتا تھا۔ جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ جب شادی ہو گئی۔ تو میں گویا تمام

حویلی کا مالک و مختار بن گیا ۔

ایک دن کا ذکر ہے ۔ کہ اس عالی شان مکان کے پائین باغ میں ہم دونوں بیٹھے مزے مزے کی باتیں کر رہے تھے ۔ صنوبر کے ہاتھ میں ایک بلور کی چوڑی کا ٹکڑا تھا ۔ جس سے وہ کھیل رہی تھی ۔ اور اس کو اچھال رہی تھی ۔ صنوبر نے اس وقت گلابی گلبدن کا تنگ پاجامہ زیب تن کر رکھا تھا ۔ سنہری پلش کی قمیص تھی ۔ اور سفید گاج کا دوپٹہ تھا ۔ چونکہ دوپہر کا وقت تھا ۔ اس لئے قرمزی دوشالہ جو وہ صبح اوڑھے تھی ۔ اُس وقت ایک چوکی پر پڑا تھا ۔ اس وقت صنوبر نے زیور کوئی نہیں پہن رکھا تھا ۔ ہاتھوں میں صرف سونے کے کڑے اور کانوں میں دُرتھے ۔ مگر اس سادگی میں بھی اُس کا حُسن بہار دے رہا تھا ۔ میں بار بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا ۔ اور یہ شعر پڑھتا تھا ؎

حاجت بناؤ کی تجھے اے نازنیں نہیں زیور ہے سادگی ترے رُخسار کے لئے

میں نے اُس وقت سر پر خاکی بنارسی دوپٹہ باندھ رکھا تھا ۔ سرمئی بانات کا میرا کوٹ تھا ۔ سیاہ پلش کا ویسٹ کوٹ تھا ۔ راس پاجامہ تھا ۔ سرخ جرابیں تھیں ۔ اور ڈاسن اینڈ کو کی دُکان کا بادامی بوٹ تھا ۔ ناظرین میں شیخی نہیں کرتا ۔ اُس وقت ہم دونوں چندے آفتاب اور چندے ماہتاب معلوم ہوتے تھے ۔ ہم دونوں چمن میں لب حوض

چوکیوں پر بیٹھے تھے۔ پرندوں کے چہچہانے حوض میں غوطہ لگانے۔ اُن کے پھڑ پھڑانے اور کلیلیں کرنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

صنوبر۔ آج اس باغ میں کیا عمدہ بہار ہے۔

میں۔ یہ سب تمہارے دم کی برکت ہے۔

صنوبر۔ کیوں خوشامد کرتے ہو؟

میں۔ خوشامد کرنے والا میرے نزدیک کافر ہے۔ اگر تم اِس باغ میں نہ ہو۔ تو یہ باغ بے شک میرے لئے کانٹوں سے بدتر ہے۔

صنوبر۔ کوئی جانے بڑی ہی محبّت ہے۔

میں۔ محبّت! میں کہتا ہوں۔ میں اگر زندہ ہوں۔ تو تمہارے لئے۔

صنوبر۔ توبہ کس قدر مبالغہ کرتے ہو۔

میں۔ پھر وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔

صنوبر۔ اچھا میں تمہاری محبّت دیکھتی ہوں۔

میں۔ شوق سے۔

صنوبر نے ہنستے ہنستے وہ چوڑی کا ٹکڑا جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ چوم کر توڑا۔ اور اُس میں سے ایک بڑا سا ریزہ بلّور کا نکل آیا۔

میں۔ دیکھا کس قدر محبّت ہے!

صنوبر۔ اچھا اب تم میری دیکھو۔

میں۔ تمہاری محبّت میری محبّت کے برابر نہیں ہو سکتی۔

صنوبر۔ سچ ہے۔ کس نگوید کہ دوغِ من ترش است ؂

میں۔ لو اچھا دیکھتا ہوں ؂

صنوبر۔ ضرور دیکھو ؂

میں نے صنوبر کی طرح باقی ماندہ ٹکڑے کو چوما۔ اور توڑا۔ تو اتفاق سے اس میں سے بھی اتنا ہی ریزہ نکلا۔ جتنا صنوبر کی دفعہ نکلا تھا ؂

میں۔ یہ بات جھوٹ ہے ؂

صنوبر۔ ہاں میری باری تو ضرور جھوٹ ہونی ہی تھی ؂

میں۔ جتنی مجھے محبت ہے تم کو نہیں ہو سکتی ؂

صنوبر۔ سبب ؟

میں۔ میں تمام زمانے سے نرالا ہوں۔ اور میری محبت بھی انوکھی ہے ؂

صنوبر۔ اچھا جی میں تم سے ایک بات پوچھتی ہوں۔ سچ سچ بتانا ؂

میں۔ تم سے مجھے کسی بات کا پردہ نہیں ہے ؂

صنوبر۔ اگر میں مر جاؤں۔ تو تم اور شادی کر لو گے ؟

میں۔ ہائے توبہ خدا کے واسطے یہ ذکر نہ کرو ؂

صنوبر۔ دیکھا میں کہتی تھی نا۔ کہ تم جواب نہیں دو گے۔ اب بات کو ٹالتے ہو۔ بس یہی آپ کی محبت ہے ؟

میں۔ ایسی بُری باتیں زبان سے نہ نکالو ؂

صنوبر۔ تم کبھی فرق نہ کرو۔ اگر بہت انتظار کرو۔ تو میرے چہلم تک کرو۔

بھلا مرد بھی کبھی کسی کے ہوتے ہیں ؟

میں۔ میری جان یہ تم کیا کہتی ہو۔ اگر خدانخواستہ تمہارے دشمنوں کو کچھ ہوجائے۔ تو میں زہر کھالوں۔ سنکھیا پھانک لوں۔ دیوانہ ہوجاؤں ۔

صنوبر۔ جناب عالی کوئی کسی کے لئے نہیں مرتا ؎

کون مرتا ہے کسی کے واسطے

ہیں یہ سارے جیتے جی کے واسطے

میں۔ دُور کیوں جاتی ہو۔ اپنے ابّا جان کی طرف تو دیکھو۔ جب سے تمہاری والدہ ماجدہ نے انتقال کیا ہے۔ اُنہوں نے کسی عورت کا منہ نہیں دیکھا ۔

صنوبر۔ یہ سچ ہے۔ مگر تمام زمانہ ابّا جان جیسا نہیں۔ مولوی سیّد ممتاز علی صاحب کی حقوق نسواں تو تم نے پڑھی ہوگی۔ اچھے لکھے پڑھوں کا حال دیکھ لو۔ بیویوں کے ساتھ اُن کا کیا سلوک ہے ۔

میں۔ یہ آپ کا غلام ابّا جان سے بھی زیادہ صادق الاقرار ہے ۔

صنوبر۔ کیا تم یہ سچّے دل سے کہہ رہے ہو؟

میں۔ ہاں خدا کو حاضر اور ناظر جان کر کہہ رہا ہوں ۔

صنوبر۔ کہو جو دل سے کھوٹ رکھے وہ رُوسیاہ ہو ۔

میں۔ آمین ۔

صنوبر۔ اچھا دو قول ۔

میں۔ قول کس بات کا لیتی ہو۔ میں تم سے پہلے مروں گا ؛

صنوبر۔ اب تم مجھے کوسنے لگے ہو ؛

میں۔ تو یہ میری۔ اگر اس زبان سے تمہارے لئے بددعا نکلے۔ تو یہ زبان جل جائے اگر اس دل میں تمہاری طرف سے کھوٹ ہو۔ تو الٰہی یہ پتھر ہو جائے ؛

صنوبر۔ جناب عورت کا بیوہ ہونے سے مر جانا بہتر ہے۔ خدا مجھے مرنے کا دن کرے۔ مگر تمہارے دشمنوں کو بُرا دن نہ دکھائے۔ عورت کی زندگی مرد سے ہُوا کرتی ہے۔ آپ چراغ ہیں۔ تو میں آپ کی روشنی ہوں۔ آپ پھول ہیں۔ تو میں آپ کی خوشبو ہوں۔ آپ موتی ہیں۔ تو میں آپ کی آب ہوں۔ میرے پیارے سرتاج۔ میرے چھتر۔ میرے مالک۔ میرا دل یہ ہی چاہتا ہے۔ کہ آپ پر صدقہ ہو جاؤں ؛

میں۔ یہ سب کچھ تم میری زبان سے کہہ رہی ہو ؛

صنوبر۔ خیر خدا بہتر جانتا ہے ؛

میں۔ خدا کرے تمہاری خضر کی عمر ہو ؛

صنوبر۔ یہ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ اور اس وقت ایک غیبانی طاقت میرے کان میں کہہ رہی ہے۔ کہ میں تم سے پہلے مروں گی اس لئے میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں ؛

میں۔ خیر تو ہے؟ اس وقت تم کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو۔ تمہاری گفتگو سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں ؂

صنوبر۔ دیکھو جی مجھ سے زمانہ سازی کی باتیں نہ کرو۔ اگر واقعی مجھ کو چاہتے ہو۔ اور پیار کرتے ہو۔ تو خدا کو ضامن دے کر میرے ساتھ ایک وعدہ کرو ؂

میں۔ اچھّا تمہارا میرا خدا ضامن ہے۔ کہو کس بات کا اقرار کراتی ہو ؂

صنوبر۔ چنبیلی۔ او چنبیلی !

میں۔ لونڈی کو کیوں بلاتی ہو۔ مجھے کہو ؂

صنوبر۔ اِس بارہ دری سے قرآن اُٹھا لاؤ ؂

میں (حیران ہوکر) کیا کرو گی ؟

صنوبر۔ جس طرح میں کہتی ہوں۔ اُسی طرح کرو ؂

مجھے یہ تاب اور مجال نہ تھی۔ کہ صنوبر کے حکم کو بجا نہ لاتا۔ فوراً بارہ دری میں گیا۔ اور قرآن اُٹھا لایا ؂

میں۔ لو ؂

صنوبر۔ اس قرآن کو لو۔ اور مجھ سے اقرار کرو ؂

میں۔ کہو۔ میں سُنتا ہوں ؂

اس وقت میرے بدن میں سنسنی سی ہو رہی تھی۔ اور صنوبر کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور کوئی طاقت غیب سے میرے کان میں

کہہ رہی تھی۔ کہ او غافل یہ کارروائی جو ہو رہی ہے۔ اُس کو مذاق نہ سمجھ ؛

صنوبر۔ کہو کہ اگر صنوبر کے مرنے کے بعد دوسرا نکاح کروں۔ تو مجھ سردار حسین کو دیدار خدا نصیب نہ ہو۔ اور اس بندے کے دین و دنیا دونوں خراب ہوں ؛

میں (جوش میں آکر) اے پروردگار۔ اگر قسمت میں یہ ہی بدا ہے۔ کہ صنوبر مجھے داغ جُدائی دینے والی ہے۔ تو میں تجھ کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں۔ اور اس قرآن پر ہاتھ رکھ کر عہد کرتا ہوں۔ کہ میں صنوبر کے بعد کسی عورت کا مُنہ نہیں دیکھوں گا۔ اور باقی ماندہ عمر اُس کی قبر پر بیٹھ کر جاروب کشی کروں گا۔ اور مورچھل ہلاؤں گا ؛

صنوبر (ہنس کر) بس اب مجھے اعتبار آگیا ؛

میں۔ (چشم پُر آب ہوکر) دیکھو تم نے اس وقت میری رُوح کو صدمہ پہنچایا۔ ورنہ میں اگر مر بھی جاتا۔ تو بھی یہ نہ کہتا۔ کہ تمہارے دشمن مریں ؛

صنوبر (ہنس کر) تو میں کون سی ابھی مرنے لگی ہوں ؛

جب صنوبر ہنس رہی تھی۔ اور میں افسوس کر رہا تھا۔ کہ وہاں خانصا قبلہ تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں سربمہر خط تھا۔ وہ خط انہوں نے مجھ کو دیا۔ اور کہا۔ کہ یہ ضروری ہے۔ اس کو خود لے کر لاہور جاؤ۔

اور لاٹ صاحب کے دفتر میں دے آؤ + آج ہی شام کو چلے جاؤ۔ چھ بجے ڈاک جاتی ہے۔ اس وقت چار بجے ہیں + چونکہ وقت تھوڑا تھا۔ میں نے جھٹ پٹ تیاری کی۔ اور صنوبر سے رخصت ہو کر لاہور کو روانہ ہُوا ::

باب نہم

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ اب جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

جس وقت لاہور کو روانہ ہُوا۔ تو میری شادی کو دو سال ہو گئے تھے۔ اور اس عرصے میں یہ پہلا دن تھا۔ کہ کئی دن کے لئے صنوبر سے جُدا ہُوا + اس وقت تک میں اس سے ایک دن بھی جُدا نہ ہُوا تھا۔ مجھے صنوبر کی جُدائی وبال جان معلوم ہوتی تھی۔ بار بار میں اُس کو یاد کرتا تھا۔ اور فرقت کے اشعار پڑھتا تھا ::

صنوبر سے اس طرح پر چند دن کے لئے جُدا ہو کر مجھے معلوم ہُوا کہ اُس کے بغیر میں ایک دن بھی نہیں جی سکتا + اب مجھے معلوم

ہوا۔ کہ اُس کی صورت میری زندگی اور میری طاقتِ حیات ہے +
میں پرندوں کو اُڑتا دیکھتا تھا۔ اور اُن کو مخاطب کر کے کہتا تھا۔
اے پرندو میری طرف سے صنوبر کی طرف یہ پیغام لے جاؤ ؎

بلبل کی زندگی گُل و گلزار دیکھنا
اور میری زندگی ترا دیدار دیکھنا

لاہور کے رستے اُس کی جدائی میں مجھے پُل صراط معلوم ہوتے تھے۔ لاہور کی رونق اور بہار مجھے مطلق اچھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے صرف صنوبر کی ہی لگن لگی ہوئی تھی۔ اور اُس کی فرقت میں ہر ایک شے مجھے کاٹنے دَوڑتی تھی +

میں نے منزل مقصود پر پہنچ کر سرائے میں بستر جمایا۔ اور جس کام کے لئے لاہور گیا تھا۔ اُس کو فوراً سرانجام دیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ کہ یہ وہ شہر ہے۔ جس میں میں پیدا ہوا۔ جس میں میں نے اپنا بچپن کا زمانہ صرف کیا + یہ وہ شہر ہے۔ جس میں میرے ابّاجان رہتے ہیں۔ اور جس میں میری امّاں دفن ہے۔ آؤ۔ لگے ہاتھ والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کے پھُول توڑ لاتے جائیں۔ پھر کب لاہور آنا ہے
ہر چند کہ میں نے والد کا کوئی سُکھ نہ دیکھا۔ اور گو سوتیلی والدہ کے ہاتھوں مجھے سخت اذیّت پہنچی تھی۔ پھر بھی میرا دل یہ ہی چاہتا تھا کہ کسی طرح ابّا کی صورت بھی دیکھ لوں۔ چاہے دور سے ہی نظر

آجائے۔ سب سے پہلے میں نے باپ کی صورت دیکھنے کا ارادہ کیا۔ اور اس جگہ گیا۔ جہاں اُن کی دُکان تھی۔ مگر مایوس اور مغموم واپس آیا۔ کیونکہ دُکان کا دروازہ بند تھا۔ ہر چند خون جوش مار رہا تھا۔ اور میرا دل یہ ہی چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح باپ کو ایک بار دیکھ لوں۔ مگر گل جان کے ظلم یاد کر کے کانپ جاتا تھا۔ اور حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ کہ گھر پر جاؤں۔ میں نے اُس کو بہت دیر تک سوچا۔ آخر سوچ سوچ کر وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کیا۔ اور دو پیسے کے پھول لے کر والدہ کی قبر دیکھنے شاہ ابوالمعالی کے قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔

جب قبرستان میں پہنچا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ والدہ کی قبر کے پاس بہت سے لوگ جمع ہیں۔ اور میرے آنے سے چند منٹ پہلے وہاں ایک نعش کو قبر میں اُتار کر اوپر مٹی ڈال رہے ہیں۔ میں نے بھی دوڑ کر مٹی دی۔ اور فاتحہ پڑھ کر مردے کی جان کو ثواب بخشا۔ جب لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس ہوئے۔ تو میں نے والدہ ماجدہ کی قبر پر پھول ڈالے۔ اور اُن کی مہربانیاں یاد کر کے بہت رویا۔ جب روتے روتے تھک گیا۔ تو رومال سے آنکھیں پونچھیں۔ اور ایک شخص سے پوچھا۔ کہ کیوں بھئی یہ نئی قبر جس میں ابھی لوگ میت دفن کر کے گئے ہیں۔ کس کی ہے؟ اس نے میرے ابا جان

کا نام لیا۔ اور کہا۔ کہ یہ سوداگر تھے۔ بڑے لائق آدمی تھے۔ چھ مہینے بیمار رہ کر آج عالمِ جاودانی کو سدھارے ہیں ؛

ناظرین میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ میرا باپ مجھے مُنہ نہ لگاتا تھا۔ اُس کا خون بالکل سفید ہو گیا تھا۔ جب سے میری والدہ نے انتقال کیا تھا۔ وہ مجھے وبالِ جان سمجھتا تھا۔ مگر اس وقت یہ سُن کر کہ اُنہوں نے آج ہی انتقال کیا ہے۔ اور یہ تازہ قبر اُن کی ہے۔ میرے کلیجے میں تیر لگا۔ اور میں بے دم ہو گیا۔ اللہ کی شان۔ مجھے مرتے دم بھی اُن کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ؎

دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اُن سے ملاقات نہ ہونے پائی

جس وقت میں اپنے باپ سے ایک آنے کے پیسے لے کر جُدا ہوا تھا۔ اُس وقت میرے دل میں یہ بات اُٹھی تھی۔ کہ اب میں ان کی شکل کبھی نہیں دیکھوں گا + ہرچند میں اس خیال کو دل سے دور کرتا تھا۔ مگر نہ ہوتا تھا + اللہ کی شان وہ بات بالکل پوری ہوئی میں اُن کی قبر پر اُس وقت پہنچا۔ جب اُن کا چہرہ خاک میں پنہاں ہو گیا۔ جب ان پر سینکڑوں من مٹی پڑ گئی + کیا تھا۔ اگر دس منٹ پہلے میں وہاں پہنچتا کم سے کم اتنا تو ہوتا۔ کہ آخری مرتبہ مُنہ تو دیکھ لیتا۔ کندھا دینا اگر نصیب میں نہیں تھا تو نہ سہی ؛

میری آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ تو والدہ ہی کی قبر پر ختم ہو چکے تھے۔ اب میں روتا تو کس طرح روتا۔ دیوانہ وار والد کے مزار پر کئی گھنٹے بیٹھا رہا آخر جب شام ہونے کو آئی۔ تو میں سرائے کی جانب نہایت مغموم اور محزون روانہ ہوا ٭

راستے میں مجھے خیال آیا۔ کہ مجھے ابا جان کی فکر تھی۔ جب وہ نہیں رہے۔ تو گل جان میرا کیا کر سکتی ہے۔ ذرا چل کر گھر کا تو حال دیکھوں + قبرستان سے میں سرائے گیا۔ اور منہ دھو کر قریب سات بجے شام کے اُس مکان کی ڈیوڑھی میں جا کھڑا ہوا۔ جہاں میری نال گڑی تھی + مجھے دل لگی جو سوجھی۔ تو میں بلا اطلاع ہی اوپر چڑھ گیا + مجھے امید تھی۔ کہ ہمارے گھر میں آج بہت سے مہمان جمع ہوں گے۔ اور گل جان نے رو رو کر اپنا حال تباہ کر رکھا ہو گا۔ مگر جب میں سیڑھیوں میں کھڑا ہوا۔ تو مجھے اوپر سے ہنسنے کی آواز آئی۔ اور مہمانوں یا سوگواروں کا وہاں نشان تک نہ پایا + اصل معاملہ یہ تھا۔ کہ گل جان نہایت بدمزاج۔ شتر کینہ اور تند خو عورت تھی + ہمسائے اُس سے تمام ناراض تھے + میرے والد کے مرنے پر جو لوگ آئے۔ وہ سب شام کو اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اور یہ اکیلی ایک ماما کے ساتھ جو میرے روپوش ہونے پر کام کاج کے لئے رکھ دی تھی۔ اس مکان میں رہ گئی ٭

جس وقت میں اُس مکان میں گیا۔ تو مجھے بچپن کا زمانہ یاد آیا۔ اور بعض باتیں جو اُس وقت بھُولی ہوئی تھیں۔ پھر مجھے یاد آگئیں + چند منٹ تک میں سیڑھیوں میں کھڑا رہا + جس وقت میں نے ہنسی کی آواز سُنی۔ تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور میں چوکنّا ہوا + چند منٹ کے بعد ایک عورت کے بولنے کی آواز سُنائی دی + یہ عورت گل جان تھی۔ میں اُس وقت سیڑھیوں میں کھڑا سُن رہا تھا ⁂

گُل جان۔ قمرن کیا کر رہی ہے۔ حُقّہ تازہ کر کے لا۔ قہ قہ تو کیوں اُداس ہے ؟

قمرن۔ اے بیوی اُداس نہ ہوں۔ تو کیا کروں ؟ خدا بخشے میاں صاحب کے دم سے گھر میں برکت تھی۔ ان کے نہ ہونے سے گھر بھاں بھاں کرتا ہے ⁂

گُل جان۔ اری نگوڑی۔ اس بڈھے کا کیا غم کرنا ؟ اچھّا ہُوا۔ ڈھلک گیا۔ کئی دن سے ہینگ ہگ رہا تھا۔ میری جان تو عذاب میں آ گئی تھی ⁂

قمرن۔ واہ بیوی۔ اچھی خاوند کی عزّت کرتی ہو!

گُل جان۔ ایسے خاوند بہتیرے دیکھے ہیں۔ تجھے کچھ خبر نہیں ⁂

قمرن۔ مجھے تو کچھ خبر نہیں ⁂

گُل جان۔ یہ میرا تیسرا خاوند تھا ⁂

قمرن۔ شاباش ٭

گُل جان۔ قہ قہ قہ ٭

قمرن۔ تب ہی آپ کو افسوس نہیں ہے ٭

گُل جان۔ میں نے تو اس کو روپے کے لئے کیا تھا۔ کہ چند دن کے لئے ڈھلک جائے گا۔ اور یہ مکان اور اَور چند ہزار روپیہ جو چھوڑ مرا ہے۔ میرے ہاتھ آئے گا ٭

قمرن۔ میں نے سُنا ہے۔ کہ اُس کا کوئی لڑکا بھی ہے۔ جو کہیں چلا گیا ہے؟

گُل جان۔ اس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ میں نے وصیت لکھالی ہے ٭

قمرن۔ اگر وہ لڑکا آجائے اور دعوے کرے؟

گُل جان۔ وہ آچکا۔ وہ مر کھپ گیا ہوگا ٭

یہ موقع میں نے اپنے ظاہر کرنے کا بہت اچھا سمجھا۔ اور جب گُل جان نے کہا۔ کہ وہ کہیں مر کھپ گیا ہوگا۔ تو میں جھٹ اوپر چڑھ گیا۔ اور کہا۔ کہ نہیں میں زندہ ہوں۔ اور یہ موجود ہوں ٭

میرا اس طرح پر یکایک نمودار ہونا واقعی عجیب تھا۔ قمرن نے یہ سمجھا۔ کہ شاید میں آسمان سے نیچے آپڑا ہوں۔ اور اُس نے چیخ ماری۔ اور گُل جان جیسی خونخوار عورت حیران رہ گئی۔ میں نے

دیکھا۔ کہ اس پانچ سال کے عرصے میں وہ پہلے سے بھی سہ چند موٹی ہو گئی ہے۔ اور اُس کی شکل پہلے سے بڑھ کر ڈراؤنی اور بھیانک نکل آئی ہے ؛

اگرچہ میرا لباس شاہانہ اور میرا طمطراق امیرانہ تھا۔ اور اب میں وہ سردار حسین نہ تھا۔ جو اس کی چلمیں بھرا کرتا تھا۔ مگر میری صورت بہت کم بدلی تھی۔ اُس نے مجھے جھٹ پہچان لیا ؛

گُل جان۔ میں اِس گھر کی مالک ہوں ؛

میں۔ پھر ؟

گُل جان۔ تمہارا مرحوم کی جائداد میں کچھ حق نہیں ہے ؛

میں۔ کس کو سُناتی ہو ؟

گُل جان۔ تم کو۔ بے شک نالش کرو۔ میں نہیں ڈرتی ؛

میں۔ تمہارا صرف آٹھواں حصّہ اور حق مہر ہے ؛

گُل جان۔ یہ تمہارے والد کی پیدا کردہ جائداد ہے۔ اور اُس نے مجھے وصیت کر دی ہے۔ بلکہ ہبہ کر کے قبضہ دے دیا ہے ؛

میں۔ میں اپنا حق عدالت کے ذریعہ حاصل کروں گا۔ کیونکہ یہ جائداد جدّی ہے ؛

گُل جان۔ نہیں پیدا کردہ ہے ؛

میں۔ نہیں۔ جدّی ہے ؛

گُل جان۔ ثبوت ؟

مَیں۔ ثبوت عدالت میں پیش کروں گا ؞

گُل جان۔ یہ آفت کہاں سے آگئی ؟

مَیں۔ افسوس ہے تم پر۔ یہ خاوند کا ماتم ہو رہا ہے ؟

گُل جان۔ میں تمہاری سوتیلی والدہ ہوں۔ میرا ادب کرو ؞

مَیں۔ اگرچہ تم اس قابل نہیں ہو۔ کہ تمہاری عزّت کی جائے۔ مگر تم میرے والد کی اہلیہ ہو۔ اور میں تمہیں والدہ کہہ چکا ہوں۔ میں ہرگز نالش نہیں کرنا چاہتا۔ اور نہ مجھے ضرورت ہے۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ اور اس مکان یا چند ہزار کی رقم جو تمہارے قبضے میں ہے۔ اور جس کی حرص میں تم نے مرحوم سے شادی کی تھی۔ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ میں دیکھنے آیا تھا۔ کہ تم نے اُس مرحوم سے کیا برتاؤ کیا ہے۔ اس کا کیسا ماتم کر رہی ہو + یاد رکھو یہ دنیا چند روزہ ہے۔ ایک دن مرنا ہے۔ ظلم وستم کی عادت چھوڑو۔ اور خدا کا خوف کرو۔ ورنہ تم اس وقت پریشان ہوگی۔ جب پشیمان ہونے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا + تم کو اس عدالت میں نادم ہونا پڑے گا۔ جہاں اُمید کے پَر جلتے ہیں۔ اور جس کا صدر نشین اس جہان کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ دلوں کے چھپے بھید جاننے والا ہے + پس تم اُس کے روبرو جانے کے لئے تیار رہو ؞

باب دہم

بُلبُل نے مجھ کو باغ میں بے تاب کر دیا
آواز ہائے یہ کسی دردآشنا کی ہے

جس وقت گُل جان نے میری شکل دیکھی تھی۔ اُس کی رُوح فنا ہو گئی تھی + وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی۔ کہ مر کھپ گیا۔ مگر جب اُس نے مجھے اِس شان و شوکت میں دیکھا۔ تو حیران رہ گئی۔ اور اس کے طوطے اُڑ گئے۔ مگر آخر کار میں نے اُس کو صاف صاف کہہ دیا۔ کہ مجھے پدر مرحوم کے ترکے سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ تو جان اور تیرا کام + یہ کہہ کر میں دل میں افسوس کرتا ہُوا اس گھر سے نکل آیا + اُس اللہ کی بندی نے اتنا نہ پوچھا۔ کہ تم کہاں جاتے ہو۔ کہاں ٹھیرے ہو۔ کھانا کھاتے جاؤ +

وہ رات میں نے سرائے میں نہایت قلق اور اضطراب میں گزاری۔ اور ایک منٹ نہیں سویا۔ تمام رات مجھے والد مغفور کی وفات کا صدمہ تکلیف دیتا رہا + علی الصّباح جب مسجد سے موذّن نے اذان دی۔ اور دڑبوں میں مرغ بولنے لگے۔ جب نسیم سحری کے جھونکوں

سے ہری ہری ٹہنیاں اس نیم کے درخت کی جو سرائے پر سایہ افگن تھا۔ متوالوں کی طرح جھومنے لگیں تو میں چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ اور اسباب باندھ کر چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اور سرائے کے ملازم کو کہا کہ جاؤ۔ گاڑی والے کو بُلا لاؤ۔ ملازم گاڑی لینے گیا۔ اور میں سر کے درد کی شدّت سے بے قرار ہو کر سرائے کے دروازہ پر جا کھڑا ہُوا۔ یہ دردِ سر بدخوابی کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ میری طبیعت ایسی بدمزہ اور بے چین تھی۔ کہ نیند کالے کوسوں چلی گئی۔ اور میں جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں۔ شب بھر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ میں ابھی سرائے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ کہ سرائے کے کونے سے ایک عورت نکل کر میری طرف آئی۔ اور میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگی۔

میں۔ مائی کیا ہے۔ ہاتھ کیوں جوڑتی ہے؟

فقیرنی (روکر) تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ راہ مولا کچھ دیتے جاؤ۔

میں۔ مائی تو محنت مزدوری کر کے گزارہ کیوں نہیں کرتی؟

فقیرنی۔ میں اس شہر میں مسافر ہوں۔ مجھے کون رکھتا ہے؟

میں۔ تو کون ہے؟

فقیرنی۔ بیٹا میں ایک غریب بدنصیب عورت ہوں۔

میں۔ سچ مچ تو نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا؟

فقیرنی۔ اگر تین دن سے میں نے کچھ کھایا ہو تو قسم برابر ہے۔

میں۔ اللہ تیرے حال پر رحم کرے؟
فقیرنی۔ اس وقت ضعف سے میرے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آرہا ہے۔ یہ دیکھو میرا کیا حال ہے؟
اس برگشتہ بخت بڑھیا نے اپنے پیٹ سے کرتا اٹھا کر مجھے دکھایا۔ اور رونے لگی + میں نے دیکھا۔ کہ اُس کے پیٹ پر ناف کے پاس ایک ناسور تھا۔ اور اُس سے پیپ بہہ رہی تھی + میں اس زخم کو نہ دیکھ سکا۔ اور میں نے جھٹ آنکھیں بند کرلیں۔ مگر اس عورت کے رونے کی آواز میرے کانوں میں آشنا معلوم ہوئی؟
میں۔ مائی میں نے تجھے کہیں دیکھا ہے؟
فقیرنی۔ نہیں بیٹا! تو نے مجھے کہاں دیکھنا؟
میں۔ نہیں مائی تیری شکل میری آنکھوں میں پھرتی ہے؟
فقیرنی۔ میرے لال میں تو اس شہر میں ابھی آئی ہوں + اس سے پہلے میں نے کبھی اس شہر کی صورت نہیں دیکھی + بھلا تو نے مجھے کہاں دیکھا ہوگا؟
جس وقت اُس فقیرنی نے میرے لال مجھے کہا۔ تو مجھے فوراً یاد آگیا۔ اور میں نے جھٹ شناخت کرلیا۔ کہ یہ تو اسی نمبردار کی بیوی ہے۔ جس نے مجھے خاں صاحب کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ اور فروخت کرنے سے پہلے نہایت بے دردی سے مارا تھا۔ مجھے اس

عورت کے حال زار پہ بہت رحم آیا۔ اور میں نے دل میں سمجھ لیا۔ کہ اس دنیا میں ایسے بہت کم ہیں۔ جو واقعی سکھی ہیں ×

اے دنیا مجھے بتا تجھ میں کوئی بھی ایسا شخص ہے۔ جس کو غم نہیں ہے۔ اور جس کو ہر طرف سے اطمینان کلّی حاصل ہے؟ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ کہ ایسا ایک بھی نہیں ہے + جتنے انسان تجھ میں ہیں۔ سب کو کسی نہ کسی قسم کا فکر اور غم ہے۔ وہ لوگ جو ظاہرا بڑے مال دار اور صاحب جاہ و جلال نظر آتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ وہ بے غم ہیں۔ اُن کے دل میں بھی غم کی پھانس ضرور چبھی ہوئی ہے۔ یہ مثل کہ تاج دار سر ہمیشہ کانٹوں پر لوٹتے ہیں۔ بالکل درست ہے + جب تک بچپن رہتا ہے۔ تب تک انسان بے فکر رہتا ہے۔ بچپن کا زمانہ بادشاہت کا زمانہ ہے۔ جب بچپن گزر جاتا ہے۔ تو دنیا کے زہریلے سانپ اور بچھو بن کر انسان کو لپٹ جاتے ہیں۔ اور دن رات اُس کو ڈستے ہیں + کوئی اولاد کے غم میں نالاں ہے اور یہ شعر حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کا پڑھتا ہے ؎

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار اگر وقتِ ولادت مار زایند

ازاں بہتر بہ نزدیکِ خردمند کہ فرزندانِ ناہموار زایند

کوئی اس بات کو پیٹتا ہے۔ کہ بیٹی کو بر نہیں ملتا + کوئی اس غم میں بے قرار ہے۔ کہ ہائے میں امتحان میں ناکام رہا۔ اور کوئی اس

فکر میں سر دُھنتا ہے۔ کہ ہائے میں عزیزوں سے دور ہوں۔ اور پیاروں سے بچھڑا ہوا دشت غربت میں پیاسا کھڑا ہوں۔ غرض مشرق سے لے کر مغرب تک مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو بالکل غم سے پاک اور صاف ہو ؏

جس وقت میں نے نمبردار کی بڑی بیوی کو تکلیف میں دیکھا۔ تو میں کانپ گیا۔ مجھے امید نہ تھی۔ کہ صرف پانچ چھ سال کے عرصے میں گردش زمانہ اُس کو یہ رنگ دکھائے گی ؏

میں۔ تم نمبردار کی بیوی ہونا ؟

فقیرنی۔ (حیران ہو کر) میں وہی نصیبوں جلی ہوں۔ تم مجھے کس طرح جانتے ہو۔ میں نے تو تم کو کبھی نہیں دیکھا ؏

میں۔ واہ مائی سردارا کو بھول گئیں ؟

فقیرنی۔ ہیں۔ تو سردارا ہے۔ یا اللہ میں خواب دیکھتی ہوں۔ کہ جاگ رہی ہوں ؟

یہ کہہ کر وہ فقیرنی دوڑ کر مجھ کو لپٹ گئی۔ اور رونے لگی میرے دل نے بھی گوارا نہ کیا۔ کہ میں اس کو پیچھے ہٹا کر اس کا دل توڑ دوں میں بھی خاموش ہو رہا۔ جب وہ اچھی طرح رو دھو چکی۔ تو میں نے کہا۔ تو اپنی سرگزشت سُنا۔ کہ تجھ پر کیا گزری۔ ابھی چھ سال بھی نہیں ہوئے۔ کہ جب میں نے تجھے دیکھا تھا۔ تو تو ادھیڑ تھی۔ اس چند

سال کے عرصے میں تیرے بالوں پر کیسی برف برس گئی ۔ یہ تیرے چہرے پر چھائیاں اور جھریاں کہاں سے نمودار ہو گئیں۔ اور تو چھ سال میں ادھیڑ عورت سے کیسے یکبارگی بڑھیا ہو گئی ۔

فقیرنی۔ میری سرگزشت یہ ہے۔ کہ میں اس نمبردار مرحوم کی خالہ کی بیٹی تھی ۔

میں۔ کیا نمبردار مر گیا؟

فقیرنی۔ اس کو مرے چھ مہینے ہوئے ۔

میں۔ اوہو! خدا اُس کو بخشے۔ اچھا اب تو اپنا قصّہ سُنا ۔

فقیرنی۔ بس بیٹا خدا تیرا بھلا کرے۔ میری شادی اُس نمبردار سے ہوئی۔ اور بیس سال تک میں اُس کے گھر آباد رہی ۔ اس بیس سال کے عرصے میں میرے ہاں نو بچے ہوئے ۔ اس میں چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں۔ مگر سب خوردسال ہی مر گئے۔ جب اُس نمبردار نے دیکھا۔ کہ میرے بچّے نہیں جیتے۔ تو اُس نے اَور شادی کر لی۔ اور مجھ پر سوت لے آیا۔ یہ لڑکی جس قسم کی تھی تو نے دیکھ ہی لی تھی ۔

میں۔ بہت اچھی طرح سے دیکھی تھی۔ تو اپنی کہانی مجھے سُنا ۔

فقیرنی۔ بس بیٹا اُس لڑکی نے گھر میں آتے ہی اپنا سکّہ جما لیا۔ اور ہر وقت مجھ سے لڑنے جھگڑنے لگی۔ نمبردار بھی اُسی کی رعایت کرتا تھا۔ اور نئی بیوی کے تھے چڑھ کر مجھے ملا کرتا تھا ۔ تیرے جانے کے بعد اس

نے مجھے ایک دن کہا - کہ صاف بات یہ ہے - کہ اگر یہاں رہنا ہے - تو میری نئی بیوی کی باندی بن کر رہ - ورنہ طلاق لے لے - میں یہ ہر روز کی لڑائی نہیں دیکھ سکتا ؛

میں - بڑا سنگدل آدمی تھا ؛

فقیرنی - اُف فو - بیٹا کچھ ٹھکانا تھا ؛

میں - اچھا پھر کیا ہوا ؟

فقیرنی - چونکہ مجھے گزارہ کرنا منظور تھا - میں نے کہا - اچھا خدا کے بندے میں لونڈی بن کر ہی رہوں گی ؛

میں - آفرین ہے تجھ پر ؛

فقیرنی - میں چکی پیستی تھی - سَوت کے لڑکے کو کھلاتی تھی - روٹی پکاتی تھی - برتن مانجھتی تھی - اور لونڈیوں کی طرح اس کلہ دراز عورت کی خدمت کرتی تھی - اس پر بھی وہ خوش نہ ہوتی تھی + ایک دن اس نے مجھے بٹاسل پر سے اُٹھا کر اس زور سے مارا - کہ ناف کے پاس لگا - اور زخم ہوگیا + جب نمبردار آیا - اور اُس کو حال معلوم ہُوا - تو وہ اُلٹا مجھ پر ہی خفا ہوا - کہ تو بڑی سُست اور بے حیا ہے - تُو نے ضرور بیوی کو دق کیا ہوگا ؛

میں - ہائے افسوس وہ بات ہوئی - کہ ؎

گر کروں نالہ تو وہ مجھ پہ خفا ہوتا ہے   رحم کی جا اُسے آجاتا ہے غصہ اُلٹا

فقیرنی۔ اس زخم میں رفتہ رفتہ کیڑے پڑ گئے + جب کیڑے اچھے ہوئے + تو یہ ناسور بن گیا۔ اور مجھ میں اس قدر طاقت نہ رہی۔ کہ میں گھر کا کام کاج کروں + ایک دن میری سَوت نے خاوند کو سکھایا۔ کہ یہ عورت بڑی گندی ہے۔ اس کے ناسور سے پیپ بہتی ہے۔ یہ ہمارے برتنوں کو ہاتھ نہ لگائے + بہتر تو یہ ہے۔ کہ اس کو رخصت کرو + نمبردار تو اُس کا غلام ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے طلاق دے دی۔ اور گھر سے ایسی حالت میں باہر کر دیا۔ کہ جب میں کسی قابل نہ رہی ⁂

میں۔ ہائے افسوس تیرے حال پر + اچھا پھر نمبردار کس طرح مرا۔ اور وہ تیری سَوت اب کہاں ہے؟

فقیرنی۔ نمبردار کا حال سُن لو۔ کہ جب اُس نے مجھے طلاق دے دی۔ اور حق مہر کی بابت یہ کہہ دیا۔ کہ میں نے بخشوا لیا ہے۔ تو اُس سے چھ مہینے کے بعد ایک دن وہ بٹائی کر رہا تھا۔ کہ ایک کتّے نے اس کو کاٹ کھایا + یہ کُتّا سودائی تھا۔ اُس دن سے چارپائی پر ایسا پڑا۔ کہ پھر نہ اُٹھا + سُنا ہے۔ کہ کُتّے ہی کی موت مرا۔ اور مرنے سے چند دن پہلے کُتّے کی طرح بھونکتا تھا۔ اور پاخانہ بھی مُنہ کے رستے آتا تھا۔ خدا جانے یہ کیا ہُوا ⁂

میں۔ یہ بھی ایک مرض ہوتا ہے ⁂

فقیرنی۔ بس بیٹا اس طرح اُس کی جان نکلی ⁂

میں۔ اور اُس تمہاری سَوت کا کیا حال ہُوا؟
فقیرنی۔ اُس کا بھی بہت خراب حال ہُوا۔ وہ ایک ہی بارہ تالی تھی۔ نمبردار کے مرنے کے بعد اُس نے اَور نکاح کیا + یہ دوسرا خاوند بڑا بدمعاش اور چھٹا ہوا گرگا تھا۔ اس نے تمام جائداد اُس نمبردار مرحوم کی تلف کر دی + نمبردار کا نابالغ لڑکا مر گیا۔ یک جدّیوں نے نالش کر کے جو کچھ رہا سہا تھا۔ وہ چھین لیا + اب میری سَوت اس نئے خاوند کے پنجے میں گرفتار ہے۔ ہر روز چکّی پیستی ہے۔ اور دانہ دَلتی ہے۔ تب کہیں جا کے مُشکل سے گُزارہ ہوتا ہے + ایک دن میں نے دیکھا تھا۔ سوکھ کے کانٹا ہو گئی ہے۔ ہاتھوں پر پھپھولے پڑے ہوئے تھے۔ اور جینے سے بیزار مرنے کو تیار تھی +
میں۔ اور تمہارے گزارے کی کیا صورت ہے؟
فقیرنی۔ بیٹا مجھے اس بیماری نے فقیر کر دیا۔ ورنہ میں ہمّت ہارنے والی نہ تھی۔ بیٹا تندرستی ہزار نعمت ہے +
میں۔ کچھ شک نہیں مائی +
فقیرنی۔ اب تو زندگی سے جی بھر گیا ہے۔ یہ ہی دل چاہتا ہے۔ کہ کہیں جلدی جان نکل چکے۔ اور اس مصیبت سے نجات ہو +
میں۔ تم علاج کیوں نہیں کرتیں اپنا؟
فقیرنی۔ بیٹا پیٹ بھرنے کو کچھ جُڑتا نہیں۔ علاج کہاں سے کروں؟

علاج کے لئے چاہئے روپیہ۔ اب میرا علاج قبر ہیں ہو گا ۔

میں۔ خدا کی درگاہ سے مایوس نہیں ہونا چاہئے ۔

فقیرنی۔ بیٹا اب میں جی کر کیا کروں گی۔ بال بچہ میرا کوئی نہیں۔ خاوند میرا نہیں۔ کوئی رشتہ دار میرا نہیں۔ میں کس لئے جیوں ؟ میں تو دعائیں مانگتی ہوں۔ کہ یا اللہ اب مجھے پردہ پوش کر لے ۔

میں۔ تو لودھیانہ میں آجا۔ میں تیری خبر گیری کروں گا ۔

فقیرنی۔ اچھا بیٹا زندہ رہی تو آجاؤں گی۔ خدا تمہیں خوش رکھے ۔

میں۔ یہ لے تیس روپے ہیں۔ تو اپنا علاج لگ کے کر جس وقت تجھ کو ذرا افاقہ ہو۔ فوراً لدھیانے آجانا۔ جب تک تو زندہ ہے۔ میں تجھ کو روٹی کپڑا دوں گا ۔

فقیرنی۔ اچھا بیٹا۔ اللہ تو جیتا رہے۔ تیری عمر دراز ہو۔ تو سات بیٹوں کا منہ دھوئے اللہ کرے۔ کوئی دُکھ درد تیرے نزدیک نہ آئے۔ اور تو ہمیشہ خوش اور خرم رہے ۔

میں۔ اچھا جاؤ خدا کے حوالے ۔

اگرچہ میں نے اُس فقیرنی کو تیس روپے دیئے۔ اور کہا۔ کہ تم میرے پاس لدھیانے آجانا۔ مگر میں جانتا تھا۔ کہ اس کا وقت آخر ہے۔ طاقت اُس کو جواب دے چکی ہے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اُس کے قابو میں نہیں رہے۔ ناف کا زخم ناسور کیا۔ بلکہ دنبل بن گیا ہے۔ زخم نے اس قدر

چکر باندھا ہے - کہ اُس میں ایک سموچا انار سما جاتا ہے ۔

حضرات ناظرین تندرستی کی قدر کرو - یہ بڑی برکت ہے - یہ ایک نعمت ہزار نعمت کے برابر ہے - اگر یہ نہ ہو - تو گنج قاروں ٹھیکروں کے انبار سے بدتر ہے - جان ہے - تو جہان ہے - ورنہ سب کچھ ہیچ ہے - جس وقت میں نے اس بیکس عورت کو اس مہلک بیماری میں گرفتار دیکھا - تو دل میں شکر کیا - کہ اس پروردگار نے مجھے تندرستی جیسی عجیب و غریب نعمت عطا کی - اور سامان درست کر کے لدھیانہ روانہ ہوا - میری صنوبر میرے انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھی - میری جدائی میں اس طرح تڑپ رہی تھی - جس طرح پانی سے نکل کر مچھلی تڑپتی ہے - جس وقت میں پہنچا تو اسے بے انتہا خوشی ہوئی - اور وہ کہنے لگی ۔

قہر تھا ہجر قیامت تھی جدائی تیری
میرے خالق نے مجھے شکل دکھائی تیری



باب یازدہم

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تیر ہر چند نہایت تیزی کے ساتھ اُڑتا ہے۔ ریل کس تیز رفتاری کے ساتھ گاڑیوں کو لے کر راہ طے کرتی ہے۔ تار برقی کیسی آناً فاناً خبر پہنچاتی ہے۔ مگر وقت اس غضب کی تیزی سے گزرتا ہے۔ کہ اُس کی تیزی کے آگے تیر اور ریل اور تار برقی سب ہیچ ہیں + ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

گزرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتیِ دخانی میں

میری شادی کو چھ سال ہو گئے۔ اور یہ چھ سال اس طرح گئے۔ جیسے چھ گھڑیاں گزرتی ہیں۔ اس چھ سال کے عرصے میں میں نے جو آرام پایا۔ وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگا + اچھے سے اچھا کھاتا تھا۔ اچھے سے اچھا پہنتا تھا۔ بادرفتار گھوڑوں پر سوار ہوتا تھا۔ شیش محل میں رہتا تھا + میرے اختیار میں اس قدر روپیہ تھا۔ کہ میں

نہیں جانتا تھا۔ کہ اس کو کس طرح صرف کروں۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات تھی۔ کہ خدا نے میری رفاقت کو صنوبر جیسی بیوی عطا کی تھی۔ جس میں تمام جہان کی خوبیاں جمع تھیں۔ اور جس کے مقابل میں سات ولایت کی دولت ہیچ تھی ؛

میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے۔ جس کو غم نہ ہو۔ مگر اس زمانے میں جس کا میں اب ذکر کر رہا ہوں۔ میں ضرور ایک ایسا انسان تھا۔ جس کو ان ایام میں کوئی غم نہ تھا + میں سچ کہتا ہوں۔ کہ اگر کوئی مجھے آکر اُس وقت یہ بھی کہتا کہ اس گھر اور اس عیش اور آرام کو چھوڑ کر جنّت قبول کر لے۔ تو میں جنّت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا + مگر ہائے افسوس میں ازل سے بدقسمت تھا۔ میری عمر مثل اُس بادل کے تھی۔ جو صبح سے لے کر شام تک آسمان پر گھرا رہتا ہے۔ اور میری خوشی کے دن گویا وہ وقت تھا۔ جس میں اتفاقیہ چند لمحوں کے لئے ابر پھٹ کر سُورج نکل آتا ہے۔ اور لحظہ بھر کے لئے روشنی ہو جاتی ہے + بعض فلسفیوں کا قول ہے۔ کہ جس طرح انسان اپنے ساتھ لکھوا کر لایا ہے۔ کہ وہ اتنے سانس دنیا میں لینے والا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے ساتھ خوشی اور رنج کی مقدار بھی لکھوا لایا ہے + میری قسمت میں جس قدر خوشی لکھی تھی۔ وہ اس مختصر عرصے میں ختم ہو گئی۔ اور باقی تمام زمانہ غم کا حصّہ ہو گیا ؛

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ میں اور خاں صاحب قبلہ شہر سے باہر گھوڑوں پر سوار ہوا خوری کر رہے تھے۔ میں سمند سیاہ زانو پر سوار تھا۔ اور خاں صاحب ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھے۔ جو انہوں نے انہیں دنوں چھ سو روپے کو خریدا تھا۔ اس گھوڑے میں یہ بدعادت تھی۔ کہ چلتا چلتا سیخ پا ہو جاتا تھا۔ اور منہ کا بھی نرم تھا۔ خاں صاحب اور میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور ہنستے چلے جاتے تھے۔ کہ دفعتاً یہ کم بخت گھوڑا سیخ پا ہوا۔ اور اس کی اس حالت میں خاں صاحب کا ہاتھ کہیں لگام کو لگ گیا۔ جس سے یہ گھوڑا الٹا گرا۔ اور خاں صاحب کا پاؤں اس کے نیچے آکر ٹوٹ گیا۔ خاں صاحب گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔ اور میں ان کو ایک پالکی میں ڈلوا کر گھر لے گیا۔ اور حکیم بلوائے۔ علاج شروع کیا۔ پانچ چھ گھنٹوں کے بعد خاں صاحب کو کہیں ہوش آیا۔ مگر خون کثرت سے نکل جانے کے بعد ان کو انتہا کا ضعف اور نقاہت ہو گئی۔

ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ چوٹ کیسے اچھی ہوتی؟ بیچارے دو مہینے تک چارپائی پر پڑے رہے۔ اور اس تکلیف کو انہوں نے نہایت استقلال اور تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ مگر ہڈی میں اندر ہی اندر ایسا فساد اور خرابی پیدا ہو گئی۔ کہ دن بدن پاؤں کی حالت خراب ہوتی گئی۔ آخر ڈاکٹروں نے یہ رائے

دی۔ کہ اگر ٹانگ کاٹ دی جائے۔ تو جان بچ سکتی ہے۔ مگر اس بات کو خاں صاحب نے گوارا نہ کیا۔ اور کہا۔ کہ میں آگے ہی نہایت ضعیف ہوں۔ اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔

جب خاں صاحب کو زیست کی اُمید نہ رہی۔ تو اُنہوں نے مجھ کو اور صنوبر کو اپنے پاس بلایا۔ مجھ کم بخت کو اپنے پلنگ کی دہنی طرف اور صنوبر کو بائیں طرف بٹھایا۔ اور بڑی دیر تک ہم دونوں کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ہم دونوں کے ساتھ اس طرح ہم کلام ہوئے۔

خاں صاحب۔ بیٹا سردار حسین اور بیٹی صنوبر۔

میں۔ جناب عالی۔

صنوبر۔ آبا جان۔

خاں صاحب۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ میں چراغ سحری ہوں اور تم دونوں سے جُدا ہونے والا ہوں۔

ہم دونوں یہ سُن کر رونے لگے۔ اور صنوبر اپنے باپ کے گلے سے چمٹ گئی۔

خاں صاحب۔ بیٹی میری بات سُنو۔

صنوبر۔ آبا جان خدا کے واسطے مجھے ایسی باتیں نہ سُناؤ۔

خاں صاحب۔ صنوبر کب تک میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ آخر ایک دن مرنا ہے۔ بڑے بڑے انبیا اور اولیا اس موت سے

نہ بچ سکے - بڑے بڑے شہنشاہ اس موت کو نہ ٹال سکے - تو میں کس شمار و قطار میں ہوں ؟

میں - میرے قبلہ و کعبہ یہ سچ ہے - مگر خدا تعالےٰ آپ کو صحت بخشے گا - آپ گھبرائیں نہیں آپ کے گھبرانے سے ہم گھبرائے جاتے ہیں ؎

خاں صاحب - میں مرتا ہوں - مگر ناشاد نہیں مرتا - میں خوش ہوں کہ میں نے دل کھول کے اس ہستئ بے اعتبار کی سیر کی - اور اچھی طرح دل کے ارمان نکالے + خداوند تعالےٰ نے مجھے ہر ایک شے دے رکھی تھی - اور ہر قسم کا آرام مہیّا تھا - اگر مجھے فکر تھا - تو بیٹی صنوبر تیرا تھا + اب وہ بھی جاتا رہا + میں نے تیرے شوہر کو اچھی طرح پرکھا ہے - اور اُسے خالص سونا پایا ہے - میں اس لئے اس دنیا کو بے فکر چھوڑتا ہوں - سردار حسین تیری بہت اچھی طرح . . . .

صنوبر - ابا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں - ابا میں تمہارے صدقے - ابا ایسی باتیں نہ کرو ؎

خاں صاحب - سردار حسین میری پنشن اور جاگیر میرے بعد بند ہو جائیں گی - کیونکہ میں اولاد نرینہ نہیں رکھتا - تم کو یاد ہوگا - کہ میں نے تم کو ایک دفعہ خط دے کر لاٹ صاحب کے سکرٹری کے پاس بھیجا تھا ؎

میں - جی ہاں قبلہ خوب یاد ہے ؎

خاں صاحب ۔ میں نے کوشش کی تھی ۔ کہ کسی طرح پنشن تمہارے نام ہو جائے ۔ یا کم سے کم جاگیر ہی بحال رہے ۔ مگر اس کوشش میں ناکامی ہوئی ۔ صرف صنوبر کو تاحیات دو سو روپیہ پنشن ملے گی ٭

میں ۔ ہم کو حضور کی زندگی چاہئے ۔ اور کچھ پروا نہیں ہے ٭

خاں صاحب ۔ یہ مکان جس میں میں رہتا ہوں ۔ اس کے مالک اب تم اور صنوبر میری وصیّت کے رو سے مشترک طور پر ہو ۔ مگر تم دونوں کو اس کے بیع یا رہن کا اختیار نہیں ہے ٭ میری منقولہ جائداد بھی تم دونوں کا مال ہے ٭ چونکہ میرے مرنے پر یہ آمدن مبلغ پندرہ سو ماہوار کی یک قلم بند ہو جائے گی ۔ اور صرف دو سو روپیہ صنوبر کو ملا کریں گے ۔ اس لئے میں تم دونوں کو یہ صندوقچی دیتا ہوں اس کو میرے مرنے کے بعد کھولنا ٭ یہ تمہارے لئے اور اگر تمہاری اولاد ہوئی ۔ تو اس کے لئے کافی ہوگی ٭

صنوبر ۔ میرے ہیروں والے ابّا ۔ میرے موتیوں والے ابّا مجھے بھی ساتھ لے چلو ۔ اگر مرنا ہے ۔ تو مجھے تنہا نہ چھوڑے جاؤ ٭

خاں صاحب ۔ بیٹی ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو ۔ تم نے ابھی کیا دیکھا ہے ٭ خدا کرے تم دونوں کی جوڑی سلامت رہے ٭

میں ۔ اور خدا آپ کو بھی ہمارے سر پر قائم رکھے ٭

خاں صاحب ۔ میری تین وصیتیں ہیں ۔ وہ ضرور پوری کرنا ٭

میں۔حضور کے ہر ایک حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں ؛
خاں صاحب۔اول تو مجھ کو اسی مکان کے پائین باغ میں دفن کرنا
میں۔آپ بار بار یہ ذکر کیوں فرماتے ہیں۔آپ کو بہ نسبت سابق
افاقہ معلوم ہوتا ہے ؛
خاں صاحب۔اخراجات کو کم کر دینا۔جتنی چادر دیکھنا۔اُتنے
ہی پاؤں پھیلانا ؛
میں۔خدا تعالےٰ آپ کو صحّت دے پھر سب کچھ دیکھا جائے گا ؛
خاں صاحب۔میری صنوبر کا دل نہ دُکھانا ؛
میں۔میرے مربّی آپ اطمینان رکھیں۔آپ کی صاحب زادی مجھے
اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔میں اُن کا دل ہرگز نہیں دُکھا سکتا ؛
خاں صاحب۔مجھے یقین ہے ؛
میں۔قبلہ ڈاکٹر جو کہتے ہیں۔تو ٹانگ کیوں نہیں علحدہ کروا دیتے۔
کہ جان سلامت رہے ؟
خاں صاحب۔لاکھ ٹانگ کاٹی جائے۔اب زیست ناممکن ہے ؛
میں۔جب تک سانس تب تک آس ؛
خاں صاحب۔میں اتنی ہی لکھوا کر لایا تھا ؛
میں۔لکھے کی کس کو خبر ہے۔میرا دل تو گواہی دیتا ہے۔کہ آپ ضرور
اچھے ہو جائیں گے ؛

خاں صاحب۔ اب قبر ہیں جا کر اچھے ہوں گے ؎

اگرچہ خاں صاحب پرلے درجے کے صابر اور مستقل مزاج انسان تھے۔ اور ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مگر دنیا ایسی چیز ہے کہ اس کو چھوڑتے ہوئے ہر ایک کو قلق ہوتا ہے + ان کی آواز سے اُس وقت یاس برس رہی تھی۔ اور حسرت ٹپک رہی تھی + اُس دن سے خاں صاحب کی حالت دن بدن بگڑنے لگی۔ مگر مرنے سے ایک دن پہلے ان میں غیر معمولی طاقت و توانائی آگئی۔ اور میں سمجھ گیا۔ کہ انہوں نے سنبھالا لیا ہے + آخر دن کو علی الصباح اُنہوں نے حکم دیا۔ کہ مرغ پلاؤ پکاؤ۔ اور جب پلاؤ پک کر آیا۔ تو تندرستوں کی طرح اشتہا کے ساتھ کھایا۔ اور بڑی دیر تک صنوبر اور میرے ساتھ بلند آواز سے گفتگو کرتے رہے + صنوبر یہ انقلاب دیکھ کر خوش ہوئی۔ اور کہنے لگی۔ کہ شکر ہے۔ ابّا جان اچھے ہوگئے + اب میں مزاروں پر گھی کے چراغ جلاؤں گی۔ اور بیت اللہ میں مخمل کا غلاف بھیجوں گی + مگر میں جانتا تھا۔ کہ یہ آخری توانائی ہے۔ اور کچھ نہیں۔ صرف سنبھالا ہے + جب دوپہر ہوئی۔ تو خاں صاحب سو گئے۔ اور پانچ چھ بجے جاگے۔ اور مجھے اشارہ سے کہا۔ کہ مجھے اُٹھا کر بٹھا + میں نے اور صنوبر نے مل کر اُن کو اُٹھا لیا ؎

خاں صاحب۔ صنوبر ؎

صنوبر۔ جی ابا جان ؂

خاں صاحب۔ یہ رکابی میں انگور کیسے ہیں ؟

صنوبر۔ (حیران ہوکر) ابا جان انگور کہاں ہیں ؟

خاں صاحب۔ یہ بزرگ کون ہیں۔ جو ہاتھ میں انگور کی رکابی لئے کھڑے ہیں ؟

صنوبر۔ یہاں تو کوئی نہیں ؂

خاں صاحب۔ صنوبر تیری والدہ بھی آئی ہیں سلام کر۔ سبحان اللہ کیا عمدہ اور خوش ذائقہ انگور ہیں ——— وعلیکم السلام۔ لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ ؂

یہ آخری الفاظ تھے۔ جو اس فرشتہ خصلت بندے کے مُنہ سے نکلے۔ اس کے بعد آنکھیں پتھرا گئیں۔ پُتلیاں پھیل گئیں۔ ہونٹ سفید ہو گئے۔ ناک کا بانسہ پھر گیا۔ اور خاں صاحب عبداللہ خاں صاحب پر اُس نیند نے غلبہ کر لیا۔ جس نیند سے آج تک کوئی نہیں جاگا ؂



باب دوازدہم

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گُل

پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

مجھے خاں صاحب کی وفات کا کمال صدمہ ہُوا۔ مگر صنوبر کو مجھ سے دس گُنا زیادہ رنج اور قلق ہوا۔ دو دن تک اُس نے کچھ نہ کھایا۔ اور مُنہ ڈھانپ کر پلنگ پر پڑی رہی ۔ ہر چند میں نے سمجھایا۔ مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ اور کئی ہفتے ماتم پدر میں سیاہ پوش اور سوگ نشین رہی ۔ ابتدا میں تو اس کو دن رات رونے سے کام تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اُس کی طبیعت سنبھلی۔ اور وہ بات چیت کرنے لگی ؛

خاں صاحب کا چہلم ہو چکا۔ تو ایک دن صنوبر کو وہ صندوقچی یاد آئی۔ جو خاں صاحب نے آخری وقت ہم کو سپرد کی تھی ؛

صنوبر۔ تم وہ صندوقچی بھول گئے ؛

میں۔ کون سی ؟

صنوبر۔ اے ہے وہی جو ابّا جان نے دی تھی ؛

میں۔ ہاں خوب یاد آگیا ہے ؟

صنوبر- الماری میں بند ہے ٭

میں- ذرا لاؤ تو سہی دیکھیں اُس میں کیا ہے ٭

صنوبر- میں اس وقت تھکی ہوئی ہوں- تم ہی تکلیف کرو- یہ لو کنجی اور لے آؤ ٭

میں- بہت اچھا میں ہی لے آتا ہوں ٭

میں صنوبر سے کنجی لے اور الماری کو کھول اُس میں سے صندوقچی نکال لایا ٭ یہ پیتل کی صندوقچی تھی- اور اُس کی کنجی اُس کے ساتھ بندھی ہوئی تھی ٭ صنوبر نے میرے ہاتھ سے صندوقچی لے لی- اور اُس کو کھولا ٭ اُس میں سے ایک ڈبّا اور ایک خط برآمد ہُوا- اُس خط کا مضمون یہ تھا:-

میری پیاری بیٹی صنوبر اور میرے پیارے آنکھوں کے تارے سردار حسین یہ خط تم کو اس وقت ملے گا- جس وقت میں ہزاروں من خاک کے نیچے پڑا ہوں گا ٭ میں اپنی زندگی میں نہایت فضول خرچ انسان تھا- اس لئے میں نقد کچھ نہیں چھوڑ چلا- جتنی میری آمدن تھی اتنا ہی خرچ تھا- اور میری آمدن اس قسم کی تھی- کہ صرف میری حیات کے لئے تھی ٭ اس لئے اس صندوقچی میں ایک ڈبّا تم کو ملے گا اس کو تم کھولنا ٭ اس میں دس ٹکڑے الماس کے ہیں- ہر ایک ہیرا پانچ پانچ ہزار کی مالیت کا ہے ٭ یہ ہیرے ہمارے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چلے آئے ہیں- اور مرتے دم وقت میرے والد نے مجھے سونپے تھے اب میں تم دونوں کے حوالہ کرتا ہوں- کیونکہ میں کوئی بیٹا نہیں رکھتا- اگر گردش

زمانہ سے کسی قسم کی تم کو تنگی ترشی پیش آئی۔ تو یہ ہیرے تمہارے کام آئیں گے ؎

تمہارا خیراندیش باپ عبداللہ خاں

صنوبر باپ کے خط کو دیکھ کر بہت روئی۔ اور دیر تک اس کو چومتی اور آنکھوں سے لگاتی رہی + پھر ہم نے اُس چوبی ڈبے کو کھولا۔ تو اُس میں سے دس ہیرے اس آب و تاب کے نکلے۔ کہ آنکھیں چُندھیا گئیں + میں نے ان ہیروں کو اس صندوقچی میں رکھ کر الماری میں صندوقچی کو بند کر دیا۔ اور کنجی صنوبر کے حوالہ کر دی + چونکہ جاگیر کی آمدنی اور پنشن بند ہو گئی تھی۔ اور صرف دو سو روپے تاحیات صنوبر کے لئے سرکار نے دینے تجویز فرمائے تھے۔ اس لئے میں نے تمام اخراجات کو کم کر دیا۔ تمام نوکر موقوف کر دیئے۔ صرف چار رہنے دیئے + مامائیں بھی رخصت کر دیں۔ صرف دو رہ گئیں + خاں صاحب کی وفات پر آٹھ گھوڑے اصطبل میں بندھے تھے۔ چھ کُتے تھے۔ اور شکار کے لئے باز وغیرہ بھی تھے + یہ سب میں نے فروخت کر ڈالے۔ صرف ایک گھوڑا اپنی سواری کے لئے رکھ لیا ؎

صنوبر۔ یہ تم نے کیا کیا ؟

میں۔ کیا جان من ؟

صنوبر۔ تمام گھوڑے کیوں بیچ دیئے ؟

میں۔ نہیں تو۔ تمام تو نہیں بیچے۔ ایک رکھ لیا ہے ؎

صنوبر۔ کون سا رکھا ہے؟

میں۔ سمند سیاہ زانو ؛

صنوبر۔ دو تین تو رکھے ہوتے ؛

میں۔ خاں صاحب قبلہ کا حکم تھا۔ کہ کفایت شعاری سے چلنا۔ میرے لئے ایک گھوڑا کافی ہے ؛

صنوبر۔ ان نوکروں کو رخصت کرتے ہوئے میرا دل گھٹتا ہے ؛

میں۔ کیا کریں امر مجبوری ہے ؛

صنوبر۔ وہ مشکی گھوڑا کہاں گیا؟

میں۔ کون سا؟

صنوبر۔ وہ ہی جس پر سے ابا جان گرے تھے ؛

میں۔ بڑا منحوس جانور تھا ؛

صنوبر۔ بیچ دیا؟

میں۔ نہیں۔ وہ تو اسی دن میں نے گولی سے مار دیا تھا ؛

صنوبر۔ اگر خبر ہوتی۔ تو اُس دن اُس پر کیوں سوار ہوتے ؛

میں۔ جب اُن کی قسمت میں ہی یہ لکھا تھا تو سوار کیوں نہ ہوتے ؛

صنوبر۔ ہائے اللہ یہ موت بھی کیا بُری بلا ہے ؛

میں۔ خاں صاحب کی شکل ہر وقت آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے ؛

صنوبر۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کہ وہ مرے ہیں ؛

میں - نہیں - یہ معلوم ہوتا - کہ جیسے کہیں باہر گئے ہیں ۔

صنوبر - جس وقت وہ یاد آتے - کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں ۔

میں - مجھے تو اُنھوں نے دوزخ سے نکال کر بہشت میں داخل کیا تھا - میرا رُواں رُواں اُن کا احسان مند ہے ۔

جس دن سے خاں صاحب کا انتقال ہُوا - میں نے باہر اندر جانا چھوڑ دیا - تمام دن صنوبر کے پاس بیٹھا رہتا تھا - کہ وہ اُداس نہ ہو - صرف کبھی کبھی علی الصباح ہوا خوری کو نکلتا تھا - اسی طرح ایک سال اَور گزر گیا - اور صنوبر نے خاں صاحب کی برسی بڑے زور شور سے کی - برسی والے دن سَو یتیموں کو کھانا کھلایا - سَو قرآن تقسیم کئے - سَو روپے کے ٹکے فقیروں کو بانٹے - اور بہت سی غریب اور بیوہ عورتوں کو جوڑے دیئے ۔

ایک دن کا ذکر ہے - کہ آسمان پر ابر چھایا ہُوا تھا - کالی کالی اور اُودی اُودی گھٹائیں آ رہی تھیں - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے - برسات کی رُت تھی - اور میں اور صنوبر بارہ دری میں بیٹھے ہوئے چہ میگوئیاں کر رہے تھے ۔

صنوبر - اس وقت تو آم کھانے کو جی چاہتا ہے ۔

میں - تم نے میرے دل کی کہی ۔

صنوبر - مگر سہارن پوری ہوں ۔

میں۔ دیسی تو کسی کام کے نہیں ہوتے ٭
صنوبر۔ یہ لو دو روپے۔ اسی وقت آدمی کو بھیجو ٭
میں۔ چنبیلی کو دو۔ سامنے تو آم والا رہتا ہے ٭
صنوبر۔ یہ جو ہمارے گھر کے سامنے دُکان کرتا ہے۔ یہ بڑا گراں فروش ہے ٭
میں۔ چلو بلا سے۔ ایسا بھی کیا گراں فروش ہے۔ اس وقت منڈی آدمی کہاں جائے اوپر سے بادل گھرا ہُوا ہے ٭
صنوبر نے دو روپے چنبیلی کو دیئے۔ اور کہا۔ کہ چکھ کر اچھے اچھے آم لانا کھٹے نہ ہوں ٭
میں۔ سہارن پوری کھٹے نہیں ہوتے ٭
صنوبر۔ چنبیلی جو پرسوں لائی تھی۔ وہ کھٹے تھے ٭
میں۔ تو وہ سہارن پوری نہ ہوں گے۔ بمبئی کے ہوں گے ٭
صنوبر۔ یہ ہی بات ہوگی۔ اُن میں ریشہ بھی تھا ٭
میں۔ کیوں جی۔ تم کو تمام میووں میں سے کون سا میوہ پسند ہے؟
صنوبر۔ پہلے تم بتاؤ ٭
میں۔ سوال میرا ہے ٭
صنوبر۔ ہم کو تو آم پسند ہیں ٭
میں۔ میں نے تم کو اور کوئی پھل کھاتے ہی نہیں دیکھا ٭

صنوبر۔ تم کو آم پسند نہیں ہیں ؟

میں۔ جب تم کو پسند ہیں۔ تو مجھ کو کیوں نہ ہوں ؟

صنوبر۔ سچ سچ کہو خاطر کی بات نہیں ؛

میں۔ مجھے تو سنگترہ یا سردہ پسند ہے ؛

صنوبر۔ ہمیں تو آم یا انگور پسند ہیں ؛

میں۔ اپنی اپنی طبیعت ہے ؛

ہم دونوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ کہ چنبیلی آموں کا ٹوکرا لے کر آئی۔ اور کہنے لگی۔ بیوی بڑے میٹھے آم ہیں ؛

صنوبر۔ ایک دیگچے میں پانی ڈال کر لے آ ؛

میں۔ وہ کیا ہوگا ؟

صنوبر۔ دھو کے کھانے چاہئیں ؛

میں۔ ہاں ٹھیک ہے مجھے خیال نہ رہا ؛

صنوبر نے ہنسی خوشی دس آم کھائے۔ اور آم کھا کر تھوڑا سا دودھ پیا۔ دودھ پینا تھا۔ کہ وہ چوکی سے گری۔ اور گرتے ہی بالکل بیہوش ہوگئی۔ میں حیران ہوا۔ کہ یہ کیا تماشا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا۔ کہ جان کے مجھے ڈرانے کے لئے بہانہ کر رہی ہے۔ مگر جب میرے پکارنے اور ہلانے سے وہ بالکل نہ بولی۔ اور اُس کی آنکھیں مجھے پتھرائی ہوئی معلوم ہوئیں۔ تو میں نے ماماؤں کو آواز دی۔ اور خود ننگے پاؤں

ڈاکٹر کی طرف دوڑا گیا۔ جو ہمارے مکان سے بیس تیس مکان کے فاصلے پر رہتے تھے۔ اس وقت میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آیا ہوا تھا۔ اور شدّت اضطراب سے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ننگے سر۔ اور ننگے پاؤں دیکھ کر حیران ہوئے۔

ڈاکٹر۔ کیوں۔ اِس قدر کیوں گھبرا گئے۔

میں۔ صنوبر ...... میں ...... میری ...... صنوبر

ڈاکٹر۔ آپ اس قدر گھبرائیں نہیں۔

میں۔ میری بیوی دفعتاً بے ہوش ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر۔ کیسے؟

میں۔ چل کر ملاحظہ فرمائیے۔

ڈاکٹر۔ کیا بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئیں؟

میں۔ جی ہاں آم کھا کر تھوڑا سا دودھ پیا ہے۔ پھر دفعتاً بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئی ہیں۔

ڈاکٹر۔ چلئے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ذرا ہوش میں لانے کی دوائیاں تیار کر لوں۔

میں۔ آپ کا کمپونڈر پیچھے لے آئے گا۔ آپ دیر نہ کیجئے۔ جلدی چلیں۔

ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ ہو لئے۔ اور میں اُن کو وہاں لے آیا۔

جہاں صنوبر بے ہوش پڑی تھی۔ اور میرے آنے تک ماماؤں نے ان کو کوچ پر لٹا دیا تھا ﴿

ڈاکٹر صاحب نے آکر نبض دیکھی۔ دل دیکھا۔ آنکھیں دیکھیں ہلایا۔ آخر میری طرف دیکھ کر کہا۔ کہ افسوس ان میں کچھ باقی نہیں + مرض سکتہ باعث موت ہوا + یہ سُن کر میرے مُنہ سے صرف اتنا نکلا ہائے مر گئی۔ اور میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر مجھے مطلق اپنے سر و پا کی خبر نہ رہی ﴿



باب سیزدہم

ہوش و حواس تاب و تواں داغؔ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں اسباب تو گیا

اگرچہ میں تمام عمر صدمے سہتا رہا۔ مگر صنوبر کا مرنا ایسا صدمہ تھا کہ اس کو میں برداشت نہ کر سکا + صنوبر کیا مری۔ میرے خرمن قرار کو آگ لگ گئی + صنوبر کیا مری میری کشتِ تمنّا پر بجلی گری + صنوبر کیا مری۔ میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا + صنوبر کیا مری میرا چراغ

مسرت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ٭

جس وقت ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا۔ کہ تمہاری اہلیہ سکتہ کے مرض سے مر گئی ہے۔ تو مجھے یہ معلوم ہوا۔ کہ کسی نے ایک برچھی میرے سینہ میں بھونک دی ہے۔ اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ اور تین دن تک میری آنکھ نہ کھلی۔ تین دن تک میں بے ہوش مطلق پڑا رہا۔ مجھے خبر نہیں۔ اس سیم تن کو کس نے سپرد خاک کیا + تیسرے دن میری آنکھ کھلی۔ تو میں ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ اور چنبیلی میرے پاس بیٹھی مکھیاں جھل رہی تھی ٭

میں۔ میری بیوی کہاں ہے ؟

چنبیلی۔ بیوی اللہ کے گھر ٭

میں۔ مجھے بھی وہاں ہی لے چلو۔ جلدی جلدی لے چلو ٭

چنبیلی۔ اب تم کو وہ قیامت کو ملے گی ٭

میں۔ قیامت تو آ گئی ٭

یہ کہہ کر میں نے ایک نعرہ مارا۔ اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگا ٭

چنبیلی۔ میاں خدا کے لئے صبر کرو۔ چوٹ لگ جائے گی ٭

میں۔ صنوبر جان۔ صنوبر جان۔ جلدی آؤ ٭

چنبیلی۔ کوئی ہے ؟ جلدی آئیے ٭

میں۔ وہ صنوبر آئی۔ بسم اللہ۔ بسم اللہ ٭

چنبیلی۔ عیدو! جلدی ڈاکٹر کو بُلالا ٭

میں۔ صنوبر جان کہاں ہیں؟

چنبیلی۔ اللہ کے گھر ٭

میں۔ جا جلدی بُلالا ٭

یہ کہہ کر میں نے چنبیلی کا ہاتھ اس زور سے پکڑا۔ کہ وہ چلّانے لگی ٭

میں۔ صنوبر میری صنوبر۔ میری پیاری صنوبر تو کہاں ہے؟

عیدو۔ میاں صاحب ابھی بیوی آتی ہیں ٭

میں۔ (نعرہ مار کر) مجھے جلدی وہاں ہی لے چلو۔ لے چلو۔ لے بھی چلو ٭

میں نے گریبان چاک کر لیا۔ چینی کے برتن توڑ ڈالے۔ میز کرسیاں اُلٹ دیں۔ اور در و دیوار سے ٹکریں مارنے لگا۔ عیدو جو میرا خدمتگار تھا۔ دوڑا دوڑا ڈاکٹر صاحب کو بُلالایا۔ اُنہوں نے آکر میرا بدن دیکھا اور کہا۔ کہ بڑے زور کا بخار ہے۔ اور سرسام کا اندیشہ ہے۔ بہت جلد ان کے سر کے بال منڈوا دو۔ اور سر پر برف رکھو۔ اور میں دوا بھیجتا ہوں۔ ایک ایک گھنٹے کے بعد پلاؤ۔ اور خبردار رہو۔ ان کی جان کے بھی لالے پڑ گئے ہیں۔ اور مجھے اُمید نہیں۔ کہ یہ بھی زندہ رہیں ٭

دو تین آدمیوں نے زبردستی مجھے پچھاڑا۔ حجام کو بلوا کر میرے بال

منڈوائے اور سر پر برف رکھنی شروع کی اور زبردستی چمچوں سے میرے منہ میں دوا ڈالی + دوا کے پینے اور برف کے سر پر لگنے سے میں پھر بے ہوش ہوگیا۔ اور آٹھ دن تک بخار میں جلتا رہا۔ خدا جانے بخار کی حالت میں میں کیا بکتا تھا۔ اور کیا شور مچاتا تھا + اللہ کی شان اس سخت بخار سے بھی میں بچ گیا۔ اور نہ مرا پر نہ مرا + آٹھ دن کے بعد بخار اُترا۔ اور مجھے ہوش آیا۔ مگر میں اس قدر ضعیف و ناتوان ہوگیا۔ کہ مجھ سے کروٹ تک نہ بدلی جاتی تھی + میرے خدمت گار مجھے دیوانہ سمجھ کر جو کسی کے ہاتھ آیا لے کر رفوچکر ہوئے + میرے مکان میں نادرشاہی لوٹ پڑ گئی۔ اور میں تباہ ہوگیا ٭

اکیس دن کے بعد میں اس قابل ہوا۔ کہ اُٹھ کر بیٹھوں + جس دن میں اس قابل ہوا۔ اُس دن رات کو عجیب تماشا ہوا + مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا اپنی واژونی قسمت پر افسوس کر رہا تھا۔ کہ سیڑھیوں میں کھٹکا ہوا۔ اور دو شخص جن کے ہاتھوں میں کلھاڑیاں تھیں۔ اور منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ اوپر آئے۔ اُن میں سے ایک کلھاڑی لے کر میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ اور دوسرے نے اُس الماری کا جو میرے سرہانے تھی۔ تالا توڑا + میں اُس وقت نہ زندوں میں تھا۔ نہ مُردوں میں + اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ اُٹھ کر مقابلہ کروں۔ نقاہت اور لاغری نے اس قدر عاجز کر دیا۔ کہ میں

مُنہ سے بول نہ سکتا تھا۔ علاوہ ازیں سر پر دشمن کلہاڑی لئے کھڑا تھا۔ صاحبان میرے سامنے ان چوروں نے تالا توڑا۔ اور وہ پیتل کی صندوقچی جس میں ہیرے تھے نکال کر لے گئے۔ اور میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ میرا شک ہے۔ کہ یہ کام میرے نمک حرام ملازموں کا تھا۔ کیونکہ اُس دن سے وہ دونوں نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ اور اکیلی چنبیلی رہ گئی۔ چنبیلی نہایت وفادار لونڈی نکلی۔ اگر یہ بھی بے وفائی کرتی۔ تو میں بھوکا مر جاتا۔ مگر اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

میں۔ چنبیلی! کیا تھا۔ اور کیا ہو گیا؟

چنبیلی۔ میاں اللہ کی شان ہے۔ دنیا کے تمام کارخانے ایسے ہیں۔

میں۔ مجھے موت کیوں نہیں آتی؟

چنبیلی۔ وعدہ کم نہ زیادہ۔

میں۔ ایسی زندگی پر تین حرف۔

چنبیلی۔ زندہ رکھنا اور مارنا خدا کے اختیار میں ہے۔

میں۔ رات کو یہ واردات ہوئی۔

چنبیلی۔ کوتوالی میں خبر کرنی چاہئیے۔

میں۔ دفع کرو۔ کیا فائدہ؟ میں آپ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں جب چیزوں والی نہ رہی۔ تو یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں؟

چنبیلی۔ شکر کرو۔ جو مرضی خدا کی۔

ہیں۔ اچھّا شکر ہے ؛

جب صنوبر کو پیوند زمین ہوئے ایک مہینہ ہوگیا۔ تو میں اس لائق ہوا۔ کہ اُٹھ کر چلنے پھرنے لگا + سب سے پہلے صنوبر کی قبر پر گیا۔ جو خان صاحب کی قبر کے ساتھ بنائی گئی۔ اور اس قبر کے ساتھ لپٹ کر بڑی دیر تک روتا رہا + پھر میرا یہ دستور ہوگیا۔ کہ تمام دن قبر پر بیٹھا رہتا تھا۔ اور شام کو گھر آکر چارپائی پر لیٹ رہتا تھا + چالیسویں دن میں نے ارادہ کیا۔ کہ صنوبر کا زیور نکال کر اُس میں سے کچھ بیوانیوں کو دوں۔ مگر جب زیور والا صندوقچہ کھولا۔ تو تمام زیور غائب + میری بیماری کے ایام میں جو جس کے ہاتھ لگا۔ وہ لے کر رفوچکّر ہوا۔ اُس وقت کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ چنبیلی میری تیمارداری میں مشغول تھی۔ باقی نوکر سب نمک حرام تھے۔ اُنہوں نے میدان خالی پایا۔ اور خوب ہی ہاتھ رنگے ؛

صنوبر کی پنشن تو اُس کے مرنے پر ہی بند گئی۔ اُس کا زیور نمک حرام نوکروں نے چرالیا۔ ہیروں والی صندوقچی قزاق لے گئے۔ خانہ داری کا اسباب جو جس کے ہاتھ آیا۔ اُس نے ٹھکانے لگایا۔ اور میں ویسا ہی قلاش جیسا اس گھر میں آیا تھا رہ گیا + سمند سیاہ زانو گھاس اور دانے کے نہ ملنے سے تھان پر کھڑا کھڑا مر گیا۔ نوکر فرار ہوگئے۔ اور گھر بھر میں جھاڑو پھر گئی ؛

اگرچہ گھر لُٹ گیا۔ اگرچہ اس گھر میں جو کسی وقت آباد تھا۔ اُلو بول گیا۔ مگر مجھے اس نقصان کی مطلق پروا نہیں ہے۔ جب میری پیاری صنوبر نہ رہی۔ تو کچھ نہ رہے + مجھے ایک سوکھی روٹی کھانے کو اور ایک پیالہ پانی پینے کو کافی ہے ؛؛

مجھے خاں صاحب کی وصیت کے بموجب اس حویلی کے انتقال کا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے میں نے پندرہ روپے ماہوار کرایہ پر دے دی ہے۔ اور اس پندرہ روپے کی آمدن سے میں اور چنبیلی گُزارہ کرتے ہیں + آج کل میری سکونت اُسی حویلی کے پائین باغ کے ایک کونے میں ہے + چنبیلی میری روٹی کی خبرگیری کرتی ہے۔ دو وقت مجھے روٹی پکا دیتی ہے۔ میں صنوبر کی قبر پر دو وقت جھاڑو دیتا ہوں۔ اور تمام دن وہیں بیٹھا رہتا ہوں + اس حال میں مجھے سولہ سال ہو گئے ہیں۔ بہت گزر گئی ہے۔ اور تھوڑی باقی ہے۔ وہ بھی اسی طرح گزر جائے گی + صنوبر جان کی مفارقت نے مجھے بالکل بدل دیا ہے۔ اب میرا یہ حال ہے ؎

کرتا نہ گر کلام۔ نہ پہچانتا کوئی
شیدا تُو چند روز میں کتنا بدل گیا

اب میں اس مکان کی مانند ہوں۔ جو کہنہ اور بوسیدہ ہو کر جھکا ہوا ہے۔ اور ذرا سی تحریک کا منتظر ہے۔ کہ فرش زمین سے ہم آغوش ہو جائے + اب میں مانند اس شیشے کے ہوں۔ جس میں بال آگئے ہوں ؎

بُلبل ہوں صحن باغ سے دُور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر

دن میرا بے قراری اور رات اختر شماری میں بسر ہوتی ہے + زندگی سے سیر ہو چکا ہوں۔ اور ابھی جتنے دن اَور دنیا کی ہوا کھانی ہے۔ وہ پورے کر رہا ہوں ÷

ناظرین قصّے کہانیاں سُنائی جاتی ہیں۔ دل بہلانے کے لئے۔ اور غم بھلانے کے لئے + میں افسوس کرتا ہوں۔ کہ میرے دردانگیز قصّے سے آپ کو بے کلی اور ملال ہُوا ہو گا۔ مگر کیا کروں۔ عالم مجبوری ہے۔ دنیا میں بہت کم ایسے ہیں۔ جن کو سچّا اطمینان اور حقیقی راحت میسّر ہے اِس ہستی ناپائدار کی جو بات ہے۔ وہ بے ثبات ہے + میرا حال سُن کر آپ کو دو باتوں کا یقین کر لینا چاہئے۔ ایک تو یہ کہ قسمت ضرور ہے۔ اور اتفاق محض ایک ڈھکوسلا ہے + جو بات وقوع میں آتی ہے۔ قسمت سے آتی ہے + دوسری بات یہ ہے۔ کہ اگر آپ رنج میں ہیں تو یہ خیال نہ فرمائیے۔ کہ آپ ہمیشہ رنج و غم اور مصیبتوں کے بے تھاہ سمندر میں ہی ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے۔ اور کبھی ساحلِ راحت آپ کو دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔ اور اگر آپ تختِ شادمانی پر جلوس فرما ہیں تو اس بات پر تکیہ نہ کیجئے۔ کہ ہمیشہ شادمانی اور کامرانی آپ کے سر پر مورچھل ہلاوے گی + تقدیر کو پلٹا کھاتے کچھ دیر نہیں لگتی + آپ نے

دیکھ لیا۔ کہ صنوبر بھلی چنگی بیٹھی آم چوس رہی تھی۔ اور آم چوستے چوستے چل بسی ؎

زرنج و راحت گیتی مشو خرم مرنجاں دل
کہ آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

اگر آپ رنج میں ہیں۔ تو راحت کے امیدوار رہیں۔ اور اگر راحت میں ہیں تو رنج کے لئے ہر وقت تیار رہیں ؛

ناظرین میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ اب مجھے اجازت دو۔ مجھے ابھی اپنا روزمرہ کا فرض ادا کرنا ہے + میں آپ کی باتوں میں ایسا مشغول ہو گیا کہ اپنا فرض بھول گیا + اب شام ہونے کو ہے۔ اور میں نے صنوبر جان کے مزار پر آج نہ جاروب کشی کی ہے۔ نہ پھول چڑھائے ہیں + میری صنوبر جان کی روح مجھے کیا کہتی ہو گی۔ الوداع

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دست تمنا بریدہ ہوں



غلام نقشبند خوشنویس امین آباد - ضلع گوجرانوالہ

مقبول عام پریس لاہور میں باہتمام ایم محمد اقبال مینیجر چھپا)؛— ،